انا کا علاج

ابھی نشست کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ لوگ مجلس میں آ کر بیٹھ رہے تھے۔ عارف بھی آ چکے تھے۔ غیر رسمی گفتگو شروع ہو چکی تھی۔ دوران گفتگو ایک صاحب نے سوال کیا: پچھلی دفعہ نشست کے آخر میں خاص انا اور عام انا والی بات ہوئی تھی۔ ان کی حقیقت اور فرق تو اچھی طرح سمجھ میں آ گیا۔ مگر ان کا علاج کیا ہے؟ عارف مسکرائے اور بولے: چلیے نشست کا آغاز اسی سے کریں گے۔

کچھ دیر بعد نشست کا باقاعدہ آغاز ہوا تو عارف گویا ہوئے: انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اسے اپنی نعمتیں، اپنی خوبیاں اور اپنی کامیابیاں تو نظر آتی ہیں، مگر دینے والا نظر نہیں آتا۔ وہ ملے ہوئے کو دیکھتا ہے۔ دینے والے کو بھول جاتا ہے۔ یہ چیز تکبر یا وہ عام انا پیدا کرتی ہے جس کا پچھلی دفعہ میں نے ذکر کیا تھا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ انسان ملے ہوئے سے زیادہ دینے والے کی طرف دیکھتا رہے۔ دینے والا اتنا بڑا ہے کہ اس کو دیکھنے سے انسان کو اپنا آپ بہت چھوٹا لگنے لگتا ہے۔ جو اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنے لگے اسے دوسرے کو کمتر سمجھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ایسا انسان کبھی تکبر نہیں کرتا۔ کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ جس نے دیا ہے وہ کسی لمحے سب کچھ واپس لے سکتا ہے۔ یہی تکبر کا اصل علاج ہے۔

''اور خاص انا کا کیا علاج ہے؟، انھی صاحب نے دریافت کیا۔

''خاص انا دراصل سچائی کے عدم اعتراف کا نام ہے۔ یہ اصلاً ابلیس کا وصف ہے۔ اس کا علاج فرشتوں کی پیروی ہے۔ انھوں نے اپنے مقام و مرتبے کو نظر انداز کر کے یہ سچائی مان لی تھی کہ اللہ نے آدم کو جو دینا تھا، دے دیا۔ لہٰذا اب انھیں بھی جھک جانا چاہیے۔ سو خاص انا کا علاج اپنے مقام و مرتبے کو نظر انداز کر کے دوسروں کے اعتراف کا نام ہے۔ یہی میرا اور آپ کا کام ہے کہ جس ابن آدم کو خدا نے جو دیا ہے، اس کا اعتراف کر کے اس کے سامنے جھک جائیں۔

ورنہ انسان شیطان بن جاتا ہے اور آخر کار خدا سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔‘‘

عارف بول رہے تھے اور ہر شخص کا سر خدا کی عظمت کے اعتراف میں جھکا ہوا تھا۔ گفتگو میں ایک لمحے کا وقفہ آیا تو اُنھی صاحب نے سوال کیا۔

’’خاص انا میں آپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ انسان تنقید کو ماننے کے بجائے اس کا جواب دینے لگے اور اپنے بجائے غلطی بتانے والے کی کمزوریاں ڈھونڈنے لگے۔ فرشتوں کی سیرت میں اس مسئلے کا تو کوئی حل نہیں۔‘‘

’’ہو بھی نہیں سکتا۔‘‘، عارف نے برجستہ کہا۔ ’’اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے غلطی نہیں کرتے۔ غلطی شیطان نے کی تھی۔ اس نے اللہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ جب اس کی غلطی پر توجہ دلائی گئی تو اس نے اعتراف کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ سے بحث شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ جیسی صاحب علم و قدرت ہستی کے سامنے یہ احمقانہ تقریر شروع کر دی کہ میں آگ سے بنا ہوں اور آدم مٹی سے۔ اس لیے میں بہتر ہوں اور بہتر کمتر کے سامنے نہیں جھک سکتا۔ یہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے بجائے اس کا جواب دینے اور تاویل کرنے کا راستہ ہے۔‘‘

’’تو گویا جو شیطان نے کیا تھا وہ ہم کو نہیں کرنا چاہیے؟‘‘، ایک اور صاحب نے نتیجہ اخذ کیا۔

’’بالکل! آپ نے درست فرمایا۔ مگر دیکھیے شیطان نے اِسی پر بس نہیں کیا بلکہ آگے بڑھ کر اپنی غلطی کا الزام یہ کہہ کر اللہ پر لگا دیا کہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے۔ یہ سرکشی کی انتہا تھی۔ یہی جرم آج بھی ہم لوگ کرتے ہیں جب اپنی غلطی پر توجہ دلانے والے کی کمزوریاں نکال کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کی تنقید معتبر نہیں۔ مگر یہ سرکشی کا شیطانی راستہ ہے جس کا انجام وہی ہے جو شیطان کا ہوا تھا۔ ابدی ذلت، ابدی محرومی ابدی جہنم۔‘‘

آج کی نشست میں انا کا اصل مجرم بھی سامنے آ گیا اور انا کا علاج بھی۔ سوال کرنے والے صاحب بے اختیار بول اٹھے۔ اعظم بعلمك و ما احسنه ۔

یمن کا مسئلہ اور یہاں کا مسئلہ

یمن کا مسئلہ آج کل ہمارے ہاں شدت سے موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ آج کے گلوبل ولیج میں کوئی خبر مقامی نہیں۔ پھر عالم اسلام سے ہماری دلچسپی بھی بہرحال ہماری قومی نفسیات کا ایک حصہ ہے۔ اس لیے ہمیں اس پر اعتراض نہیں کہ آج سیاسی، صحافتی اور سماجی حلقوں میں یہ مسئلہ کیوں زیر بحث ہے۔

ہمیں بڑے ادب سے صرف یہ توجہ دلانی ہے کہ جس ملک میں نظام تعلیم تباہ ہو چکا ہے، جس ملک میں حکومتی سطح پر صحت کی سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں، جس ملک میں ہر دوسرے گھر میں ایک بے روزگار نوجوان موجود ہے، جس ملک میں ہر چوتھے گھر میں، بالوں میں سفیدی لیے کوئی بن بیاہی بچی بیٹھی ہے، جس ملک میں ہر روز میرٹ کا قتل عام ہوتا ہے، جس ملک میں عدالت سے انصاف لینا جوئے شیر لانے کے برابر ہے، وہاں بین الاقوامی تنازعات میں اہل دانش کی ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی دلچسپی ان کی دانش پر سنجیدہ سوالات پیدا کر دیتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ یمن سے چند سو پاکستانیوں کی واپسی کا مسئلہ اہم ہے، یہ سچ ہے کہ پاکستانی فوج کا وہاں کی جنگ میں حصہ لینا نہ لینا اہم ہے، مگر اس سے کہیں زیادہ اہم یہ حقیقت ہے کہ ملک میں ہیپاٹائٹس سی کا جان لیوا مرض وبا کی طرح پھیل چکا ہے۔ نقل کا کینسر پورے نظام تعلیم کو کھا چکا ہے۔ کرپشن کا زہر پورے معاشی ڈھانچے کو ختم کر رہا ہے۔ الیکشن میں دھاندلی کا زہر پورے سیاسی نظام کو غیر معتبر بنا چکا ہے۔ انتہا پسندی کا مرض مذہب کے روشن چہرے پر داغ لگا چکا ہے۔

کاش ہمارے اہل دانش ''ہاٹ'' چیزوں سے اوپر اٹھ کر حقائق میں جینا شروع کر دیں۔ ان کے لیے بین الاقوامی سے زیادہ مقامی مسائل اہم ہو جائیں۔ وہ کرپشن، جہالت، دھاندلی، میرٹ، امن اور انصاف کو اپنا اصل مسئلہ بنا لیں۔ جس روز یہ ہو گیا ہماری تقدیر بدل جائے گی۔

اِسی میں زندگی ہے

قرآن مجید میں مسلمان حکمرانوں پر یہ فریضہ عائد کیا ہے کہ وہ بے گناہ قتل ہونے والوں کا قصاص لیں۔ قاتلوں کو بغیر کسی رعایت کے سزائے موت دی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو بیان کرتے ہوئے وہ جملہ ارشاد فرمایا ہے جو کسی اور حکم کو دیتے ہوئے نہیں کہا یعنی ''اے عقل والو! تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے''(البقرہ 2:179)۔

بدقسمتی سے دور جدید میں کچھ ''عقل'' والوں نے یہ منطق تراشی ہے کہ قاتلوں کو سزائے موت دینا غلط ہے۔ یہ سوچ اب دنیا میں اتنی مقبول ہے کہ دنیا کے 103 ممالک قانونی طور پر اور 50 ممالک عملی طور پر سزائے موت کو ختم کر چکے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے تک پاکستان کا شمار بھی ایسے ممالک میں ہوتا تھا جہاں عملی طور پر سزائے موت پر پابندی لگی ہوئی تھی۔ اور سن 2008 سے 2014 تک سزائے موت کے کسی مجرم کو پھانسی نہیں دی گئی۔ مگر دہشت گردی کے ایک بہت بڑے واقعے کے بعد پچھلے کچھ عرصے سے اس پر سے پابندی ہٹالی گئی ہے۔

بدقسمتی سے کچھ حلقے ایک دفعہ پھر سزائے موت پر پابندی کے لیے سرگرم ہو چکے ہیں۔ پہلے بھی پاکستان میں سزائے موت کے خلاف ایک فضا موجود ہے۔ مثال کے طور پر سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو صاحبہ نے 1988 میں پہلی دفعہ اقتدار میں آنے کے بعد سزائے موت کے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا تھا۔ ان میں معصوم سسٹر ٹرپل مرڈر کیس کے مجرم بھی شامل تھے۔ یہ اس زمانے کا مشہور کیس تھا جس میں کراچی کی ایک پر رونق سڑک پر معصوم نامی ایک صاحب کو قتل کر کے ان کی دو جوان بیٹیوں کو اغوا کر لیا گیا اور کئی دن تک ان لڑکیوں کو گینگ ریپ اور بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کر دیا گیا تھا۔ مگر یہ مجرم بھی رہائی پا کر مزے سے جینے لگے۔

یہی ذہن آج ایک دفعہ پھر فعال ہو چکا ہے۔ اس وقت تو دہشت گردی کے خلاف ایک فضا

موجود ہے اور ہزاروں بے گناہ مرد و زن اور معصوم بچوں کی جانوں کی قربانی کے بعد سزائے موت پر عملدرآمد بحال ہوا ہے، مگر زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ یورپی ممالک کے فنڈز پر چلنے والی این جی اوز اس سزا کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں گی۔ بہانہ یہ ہوگا کہ ہمارا نظام عدل انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہے تو نظام عدل کو بہتر بنانے کی مہم چلانی چاہیے۔ ورنہ یہ استدلال تو ہر قسم کی سزا کے خلاف پیش کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ نظام عدل ٹھیک نہیں اس لیے کسی جرم کی سزا بھی نہیں ملنی چاہیے۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتنا بودا استدلال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سزائے موت کسی مقتول کی زندگی تو نہیں لوٹا سکتی، مگر ان کے لواحقین کے سینے کو ضرور ٹھنڈا کرتی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کچھ مجرموں کو پھانسی دے کر باقی معاشرے کو یہ پیغام دیتی ہے کہ اگر کسی کی جان لی گئی تو بدلے میں اپنی جان دینی پڑے گی۔ انسان کو سب سے بڑھ کر اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ چنانچہ قتل کا رجحان رکھنے والے ہر شخص کو یہ اندیشہ رہے گا کہ اگر اس نے کسی کی جان لی تو پورا معاشرہ اس کی جان کے درپے ہو جائے گا۔ مگر سزائے موت کے خاتمے کی سوچ دراصل معاشرے کو یہ پیغام دیتی ہے کہ تم جتنے لوگوں کی چاہے جان لو، اس کے بعد تم اطمینان سے اپنی زندگی کے دن پورے کرو گے۔ بہت ہوا تو آٹھ دس سال کی سزا کاٹ کر دوبارہ معمولات زندگی میں مصروف ہو جاؤ گے۔

انسانی نفسیات کو اللہ تعالیٰ سے بہتر کوئی جان سکتا ہے؟ مغرب کے سماجی ماہرین اس معاملے میں ہر اعتبار سے غلطی پر ہیں۔ ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں مغربی ماہرین کی پیروی کرنی ہے یا اللہ تعالیٰ کے احکام کی۔ اگر ہم اللہ کے احکام کی پیروری نہیں کریں گے تو بلاشبہ اپنے معاشرے کو تباہی و بربادی کا شکار بنا دیں گے۔

انسان اور دنیا

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات کئی مقامات پر واضح کی ہے کہ اس نے انسانوں کو اس دنیا میں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ مثلاً سورہ ملک کے آغاز میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

بہت بزرگ، بہت فیض رساں ہے، وہ (پروردگار) جس کے ہاتھ میں عالم کی بادشاہی ہے، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (وہی) جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی، (الملک 67:2-1)

قرآن کریم اس بات میں بالکل واضح ہے کہ دنیا کے اس امتحان کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ کون بن دیکھے اور بغیر کسی جبر کے محض خدا کے خوف اور اس کی رضا کی خاطر اسی کی بندگی کا راستہ اختیار کرتا ہے اور کون شیطان کی پیروی کر کے جہنم کو اپنی منزل بنالیتا ہے۔

ہم میں سے ہر شخص ہر لمحہ اسی امتحان میں جی رہا ہے۔ ہمیں جو چاہے بولنے کی آزادی ہے۔ جو چاہے کرنے کی آزادی ہے۔ مگر یہ آزادی لامحدود نہیں بلکہ اس دنیا کی زندگی تک محدود ہے۔ ایک روز آئے گا جب ہر انسان کی طرح یہ دنیا بھی ختم کردی جائے گی۔ پھر ایک نئی دنیا پیدا کی جائے گی۔ اُس دنیا میں ساری کی ساری نعمتیں جنت کی بستی میں جمع کردی جائیں گی اور تمام عذاب جہنم کے قید خانے میں مہیا کردیے جائیں گے۔

پھر وہ لوگ جنھوں نے برائی کے تمام اسباب ہونے کے باوجود نیکی کی راہ اختیار کی، وہ ہمیشہ کے لیے جنت میں بسا دیے جائیں گے تاکہ صبح و شام اللہ کی نعمتوں سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے امتحان کی مہلت کو غفلت اور سرکشی میں گزارا، جہنم کا قید خانہ ان کی منزل ہوگا جہاں وہ ابد تک روتے اور چلاتے رہیں گے۔

امتحان اور اختیار

ہم میں سے ہر شخص اپنے زمانہ تعلیم میں امتحانی عمل سے گزرا ہے۔ہم جانتے ہیں امتحان دیتے وقت ہمیں ایک امتحانی کاپی دی جاتی ہے اور اس بات کا مکمل وقت دیا جاتا ہے کہ ہم امتحانی کاپی پر اپنی صلاحیت، علم، محنت اور ہنر کا مظاہرہ کریں۔ چنانچہ ذہین اور قابل بچے اپنی امتحانی کاپی پر سوالات کے ٹھیک ٹھیک جوابات لکھتے ہیں اور نکمے اور نالائق بچے امتحانی کاپی کو خالی چھوڑ کر آجاتے ہیں یا غلط جواب لکھتے ہیں۔

امتحان دیتے وقت طلباء کو اس کی اجازت تو ہرگز نہیں ہوتی کہ وہ نظم وضبط کی خلاف ورزی کرکے یا شور شرابا کرکے دوسرے طلباء کو ڈسٹرب کریں، لیکن اس بات کی مکمل آزادی ہوتی ہے کہ وہ امتحانی کاپی میں جو چاہے لکھ کر آئیں۔اس آزادی کے بغیر امتحان نہیں ہوسکتا۔

یہی معاملہ دنیا کے امتحان کا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے پوری انسانیت کو ڈالا ہے۔یہ امتحان کبھی رونما نہیں ہوسکتا اگر اس دنیا میں لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق اچھے اور برے راستے پر چلنے کا اختیار نہ ہو۔چنانچہ انسانوں کو یہ بھرپور اختیار دیا گیا ہے کہ جو چاہے وہ ایمان وعمل صالح کی سیدھی راہ اختیار کرے اور جو چاہے وہ ظلم، سرکشی اور معصیت کی راہ چن لے۔

اس امتحان میں خیر وشر کی طاقتیں اپنا کام کرتی ہیں۔ چنانچہ پیغمبر اور ان کے نائبین نیکی کی طرف بلاتے ہیں اور شیاطین گمراہی کی راہ کی طرف پکارتے ہیں۔مگر اس امتحان میں اختیار کی آزادی اتنی اہم ہے کہ پیغمبر جیسی بلند ہستیوں کے ہاتھ میں بھی نہیں کہ وہ کسی ایسے شخص کو ہدایت دیں جو خود ہدایت نہ حاصل کرنا چاہتا ہو۔اسی طرح ابلیس کو یہ اجازت نہیں دی گئی کہ وہ خدا کے نیک بندوں کو زبردستی اپنے پیچھے چلائے۔یہی اختیار وہ امانت الٰہی ہے جس کا درست استعمال جنت اور غلط استعمال جہنم کا ضامن ہے۔

پروفیسر محمد عقیل

خدا کو دل میں بسانا ہے۔۔۔

"میں خدا کو دل میں بسانا چاہتا ہوں۔"۔اس نے اپنے آپ سے مکالمہ کیا

’’خدا کو اپنا شریک پسند نہیں‘‘۔اسے اندر سے ضمیر کی آواز سنائی دی۔

’’لیکن میں تو موحد ہوں، خدا کو ایک مانتا ہوں، میں نے کسی بت کے آگے سجدہ نہیں کیا‘‘۔ اس نے جواب دیا۔

’’اچھا، ذرا اپنے دل میں جھانکو کہ اس میں کون کون رہتا ہے۔کیا اس میں دولت کی لونڈی راج نہیں کرتی؟ کیا انا کا بت سر تان کر نہیں کھڑا؟ کیا سفلی خواہشات کی دیواریں موجود نہیں؟ کیا حسد و کینہ کی آگ نہیں جل رہی؟‘‘ضمیر نے تند لہجے میں سوال کیا۔

ابھی وہ جواب سوچ ہی رہا تھا کہ دوبارہ ضمیر نے بولنا شروع کر دیا:

’’تم جب کسی مہمان کو گھر میں بلاتے ہو گھر کی صفائی کرتے ہو، کمرہ خالی کرتے ہو، اسے سجاتے ہو۔لیکن خدا کو ایسے گھر میں بلا رہے ہو جو گندگی سے بھرا ہے، جس میں پہلے ہی دنیا نامی اجنبی عورت رہتی ہے، جس میں چاروں طرف کینہ و بغض کے جالے ہیں، جس میں انتقام کے سانپ لوٹ رہے ہیں، جس میں ظلم و زیادتی کے بھیڑیئے دانت نکوسے کھڑے ہیں۔ ایسے گھر میں تم خدا کو بلاتے ہو؟ کچھ تو حیا کرو‘‘۔

وہ ششدر رہ گیا۔اسے علم ہی نہ تھا کہ اس نے کیا کر دیا۔اس نے ہمت کر کے پوچھا:

’’لیکن میں تو نماز، روزہ حج زکوٰۃ کا پابند۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ ابھی اس کا جملہ مکمل ہی نہیں ہوا تھا کہ ضمیر کی چنگھاڑتی ہوئی آواز آئی:

’’اپنی پاکی اپنے پاس رکھو‘‘۔

وہ بھیگی ہوئی آنکھوں سے واپس لوٹ گیا۔ رات بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا لیکن کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ وحشت سے گھبرا کر باہر نکلا تو چارسو اندھیرا تھا، گہرے بادلوں کی وجہ سے سیاہی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اس کے اندر کی سیاہی کالی رات سے زیادہ گہری تھی۔ اچانک اسے بہت رونا آیا، وہ روتا رہا روتا رہا یہاں تک کہ وہ نقاہت کے باعث گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا، آنکھیں پرنم اور پورا بدن نڈھال۔

اسی اثنا میں اس ضمیر کی آواز دوبارہ آئی۔

''خدا کو اپنے من میں بسانا چاہتے ہو تو دل کے گھر کو خالی کردو۔ اس میں سے وحشی درندوں، پھنکارتے سانپوں، نامحرم ساتھیوں کو نکال دو۔ اس کے بعد اسے خدا کے خوف سے آراستہ کرو، عبادت کا رنگ وروغن کرو، نوافل کے بیل بوٹے لگاؤ، رحم دلی کی چوکھٹ لگاؤ اور خوش اخلاقی کی شمع روشن کرو۔ پھر اپنے رب کے سامنے دوزانو ہو کر دعا کرو کہ وہ تمہارے دل میں آ کر بس جائے۔''

''کیا اس طرح خدا میرے ساتھ رہے گا؟''۔ اس نے سوال کیا۔

''ہاں، خدا تمہارے ساتھ رہے گا۔ لیکن یاد رکھو، اسے شراکت پسند نہیں، جونہی اپنے دل میں کسی اور کو بساؤ گے تو وہ دل سے نکل جائے گا۔ وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے، وہ تنہا بادشاہ ہے وہ تمہارے دل میں مہمان کی طرح نہیں حاکم کی طرح رہے گا، اسی کی بات ماننی ہے، اس کے منع کرنے پر رکنا اور حکم پر کام کرنا ہے۔ اگر اس کی حکم عدولی کی تو وہ سزا دے گا اور اگر اس کی بات مانتے رہے تو وقت آنے پر وہ کچھ دے گا جس کا تصور نہیں کرسکتے۔'' ہاتف نے جواب دیا۔

اس نے سر اٹھایا تو دور افق کے پار کرنیں نمودار ہورہی تھیں، اجالا پھیل رہا تھا۔ اس نے اپنے باطن میں جھانکا تو علم ہوا کہ اندر بھی تاریکی چھٹنے لگی تھی۔ وہ اٹھا اور اس عظم کے ساتھ اٹھا کہ ایک عظیم ہستی کو دل میں بسانا ہے۔

فرح رضوان

نصیب کی بند گلی

کوئی شخص اپنی منزل تک پہنچنے کو کتنا ہی بے قرار ہو اسے ٹریفک سگنل کی سرخ لائٹ پر خود کو بریک لگانے کا عادی بنانا ضروری ہے۔ ورنہ منزل سے ملاپ کا خواب ادھورا اور کسی ناگہانی سے تصادم کا قوی فیصد اندیشہ ہے۔

نجی زندگی میں بھی بروقت بریک لگانا وہ فرق ہے جو ''تصادم اور ملاپ'' کے بیچ ہوتا ہے۔ اگر کسی کو یہ فرق سمجھ آ جائے تو ہمارا خاندان اور معاشرہ ٹوٹنے اور بکھرنے سے محفوظ ہو جائے گا۔ زندگی میں آزمائش یہی ہے کہ آپ اپنے طور پر کتنی ہی جلدی میں ہوں، لیکن کبھی بس کھڑے کھڑے دوسروں کے حصّے کی بتی سبز ہوتے دیکھنا ہی مقدر ہوتا ہے۔ لیکن اس مقام پر گاڑی کو واپس موڑنے، جھنجھلانے، چلانے اور اگلی گاڑیوں کے بالکل پیچھے اپنی گاڑی لگا کر گاڑی چلانے سے آپ خود کو بھی شدید نقصان پہنچانے کے ساتھ دوسروں کے لیے بھی ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں۔، کبھی یہ آزمائش آ جاتی ہے کہ آپ کا سگنل تو سبز ہے لیکن ایمبولینس کے لیے رکنا پڑتا ہے اور کبھی آپ کے راستے سے کوئی بزرگ یا بے پروا راہگیر اتنا آہستہ گزرتا ہے کہ سگنل واپس سرخ ہو جائے تو سوائے صبر کے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

زندگی کی تیز ترین شاہراہ پر hit & run کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ یہاں کا ٹریفک اوپر والا چلاتا ہے، وہ اگلے موڑ پر اگر آپ کی گرفت نہ بھی کرے تو عین منزل پر کر لے گا۔ انسان اپنی چرب زبانی سے زندگی میں کتنے ہی قانون توڑے، ہر طرح کے ضابطہ اخلاق کو بالائے طاق رکھ دے، اور جب کبھی اس لاقانونیت کے باعث کوئی تصادم ہو تو گواہ نہ ہونے پر سفید جھوٹ بول کر صاف بچ جائے، لیکن ایک روز اس کی پکڑ ہو کر رہے گی۔ نصیب کی بند گلی اس کا تعاقب نہیں چھوڑے گی۔

شمائلہ عثمان

اخلاق

ابوعبداللہ محمد ابن موسیٰ الخوارزمی سن 780 عیسوی میں خوارزم میں پیدا ہوئے 850 میں بغداد میں وفات پائی۔ وہ حساب، الجبرا اور جغرافیہ کے ماہر تھے۔ خاص طور پر فادر آف الجبرا کہلائے۔

انہوں نے انسان کے بارے میں ایک حساب ترتیب دیا انسان کے پاس اخلاق ہے تو ایک (1) نمبر انسان کے پاس ہے۔ خوبصورتی ہے تو ایک کے ساتھ صفر لگاؤ اور اسے دس (10) بناؤ۔ اگر دولت ہے تو ایک اور صفر لگا کر سو (100) بناؤ۔ اب اگر اخلاق کا ایک ہٹا دو تو بس بندہ صرف 00 رہ جائے گا اور صفر جتنی بھی ہوں انکی کوئی ویلیو نہیں ہوتی۔

یہ اخلاق ہے کیا؟ پیدائشی طور پر تمام اعلیٰ اوصاف انسان کے اندر موجود ہوتے ہیں لیکن ان کو عملی طور پر باہر لانا انسان کا اپنا اختیار ہے۔ یہی عملی کام اخلاق کہلاتا ہے۔ اخلاق کا تعلق کسی مخصوص دین، جماعت، فرقے، قوم یا نسل سے نہیں ہے۔ یہ ہر انسان کی جبلت میں موجود ہے۔ انسان کو اس دنیا میں مختلف ماحول اور مسائل کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ منفی رویوں اور تجربات سے بھی نبرآزما ہونا پڑتا ہے۔ ان ہی منفی عوامل میں سے مثبت کو نکالنا ہی اعلیٰ اخلاق ہے۔

بعض اوقات انسان کا واسطہ ایسے حالات سے ہو جاتا ہے کہ اخلاقی اوصاف ترک کرنا ہی واحد راستہ نظر آتا ہے۔ انسان مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی مایوسیوں سے نکلنے کے لیے انسان کو صبر اور ہمت سے کام لینا چاہیے۔ اگر ہر انسان منفی میں سے مثبت نکالنے کی کوشش میں لگ جائے تو یہی فی زمانہ اخلاقی جہاد ہے۔ پھر الخوارزمی کے قانون کے مطابق خوبصورتی، دولت اور حسب نسب نکال بھی دیئے جائیں تو اخلاق کا ایک ہی اسے منفرد مقام عطا کر دے گا اور یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راستہ ہے۔

سلسلہ روز وشب

ابو یحییٰ

اسلام اور خلافت

اس وقت ہمارے ملک میں بیانیے کی ایک بحث جاری ہے۔اس بحث کا تناظر پاکستان میں جاری وہ دہشت گردی ہے جس نے پچھلے کئی برسوں میں تقریباساٹھ ہزار سے زائد پاکستانیوں کی جانیں لے لی ہیں۔احباب کی طرف سے یہ تقاضہ سامنے آیا ہے کہ میں اس موضوع پر اظہار خیال کروں۔ خاص کر وہ احباب جو مجھے براہ راست جانتے ہیں اور جنھوں نے میری کتاب ''تیسری روشنی'' پڑھ رکھی ہے، ان کا خیال ہے کہ چونکہ میں ایک طالب علم کی طرح اس خاص بحث سے بہت پہلے گزر چکا ہوں ، اس لیے مجھے اپنی فکری دریافت لوگوں کے ساتھ ضرور شیئر کرنی چاہیے۔

ایمان اور عصبیت

اِدھر میرا معاملہ یہ ہے کہ عرصہ ہوا میں نے اس قوم کے اصل مرض کی تشخیص یہ کی ہے کہ یہاں ایمان کے بجائے تعصّبات وخواہشات اور عمل صالح اور اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے کچھ اور چیزیں دین داری کا معیار بن چکی ہیں۔ چنانچہ کرنے کا کام ان چیزوں کی اصلاح ہے۔ ورنہ ان فکری بحثوں کا نتیجہ بارہا یہ نکلتا ہے کہ ایک گروہ تو اندھا مخالف بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور دلیل واستدلال سے آگے بڑھ کر نیت اور محرکات کے فیصلے کر کے مہم جوئی شروع کر دیتا ہے۔ جبکہ دوسرے لوگوں کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ ایک تعصب سے نکل کر دوسرے تعصب میں چلے جاتے ہیں اور ایک گروہ کے بجائے دوسرے گروہ کی عصبیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جبکہ دین کا اصل مقصد تو اعلیٰ اخلاق کے حامل ایسے انسان پیدا کرنا ہے جو ہر طرح کے تعصّبات اور

خواہشات سے بلند ہوکر اللہ کی رضا کو اپنا مقصد بنالیں۔ جنت کی بادشاہی، لاریب، انھی لوگوں کی منزل ہے۔ یہی کام جو بظاہر ''ہاٹ'' نہیں، نہ اس میں زیادہ شہرت اور ناموری ملتی ہے، اس عاجز نے اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ یہ کام اتنا اہم ہے کہ کسی اور مصروفیت کی اجازت نہیں دیتا۔

پھر یہ کہ آج کل میں نے ''جب زندگی شروع ہوگی'' اور ''قسم اس وقت کی'' کے بعد اس سلسلے کے تیسرے ناول پر کام شروع کردیا ہے۔ یہ ناول نگاری میری ڈھیر ساری مصروفیات کے ساتھ بہرحال ایک مشکل کام ہے۔ مگر کیا کروں کہ ابھی تک اس طرز نگارش کی پہنچ کسی بھی دوسرے ذریعہ سے زیادہ ہی ثابت ہوئی ہے۔ اس لیے کچھ اہم باتیں جو کہنی ہیں وہ اسی تیسرے ناول کے ذریعے سے لوگوں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

ایسے میں کسی فکری بحث میں اترنا جس توجہ اور وقت کا طالب ہے، اس کی دستیابی آسان نہیں۔ مگر بعض احباب نے میری خاموشی کو ''کتمان حق'' قرار دے دیا تو مجبوراً مجھے اس معاملے میں کچھ مختصر گزارشات پیش کرنا پڑ رہی ہے۔ کسی بحث یا جوابی بحث میں الجھنا اس خاکسار کے پیش نظر نہیں۔ میں گرچہ اپنے مزاج کے لحاظ سے ایک داعی ہوں لیکن میں اپنے مالک کے عطا کردہ دین کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی ہوں۔ طالب علمانہ طریقے پر یہ جانتا ہوں اور بیان کرسکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین سے متعلق کیا چاہتے ہیں اور کیا نہیں۔ اور اگر ان کی بات ہی ٹھیک طور پر سامنے نہیں آرہی تو اس کا سامنے لانا بہرحال ایک ذمہ داری ہے۔

تاہم میں ہمیشہ اس کے لیے تیار رہتا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ میں ہی غلط ہوں۔ اس لیے اگر کوئی بھائی یا بہن علمی طریقے پر (نہ کہ استدلال سے خالی، اعتماد سے بھرپور جذباتیت اور دلیل کے نام پر نکتہ آفرینی کرکے) غلطی واضح کردیں گے کہ میں ہی غلط جگہ پر ہوں تو کسی بحث میں الجھے بغیر میں اپنی اصلاح کرلوں گا۔ میرا حال تو یہ ہے کہ بچپن سے آج تک تعصّبات کے جتنے

بت تھے، ہر ایک کو توڑا اور چھوڑا ہے۔اس ''بت شکنی'' کے لیے یہ عاجز ہمیشہ تیار رہتا ہے۔اس لیے کہ یہی ایمان ہے۔باقی صرف کہانیاں ہیں یا پھر ایمان کے وہ دعوے ہیں جن کی قلعی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کھول کر رکھ دیں گے۔ہم سب کو اس انجام سے اپنے رب کی پناہ مانگنی چاہیے۔

تین بنیادی سوالات

آگے بڑھنے سے قبل میں یہ واضح کرنا چاہوں گا اب کچھ بزرگوں کے نام آئیں گے۔ یہ سب اِس دور میں امت کے بڑے اہل علم ہیں۔ان میں سے ہر ایک سے میں نے بہت استفادہ کیا ہے۔اس لیے میرے دل میں ان کے لیے بے حد محبت اور احترام ہے۔تاہم یہ مقام اور مرتبہ میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے چکا ہوں اور بلاشبہ یہ صرف سرکار دو عالم ہی کا حق ہے کہ ان کی ہر بات کا دفاع کیا جائے۔آپ سراپا حق ہیں اور صرف آپ ہی حق ہیں۔باقی لوگ جتنے بڑے عالم بھی ہوں، بہرحال انسان ہیں۔ان سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ان کی بات غلط ہوسکتی ہے۔مگر ان کی کسی بات سے اختلاف کا مطلب ان کے مقام ومرتبہ کو کم کرنا نہیں بلکہ یہ اس بات کا اظہار ہے کہ وہ بہرحال رسول اور نبی نہیں ہیں جن سے اختلاف نہیں ہوسکتا۔تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کی ایک چیز سے اختلاف کے باوجود ان کی دس چیزوں سے مجھے اتفاق بھی ہے۔میں ان کی عظمت کو ان کی خدمات کے حوالے سے یاد رکھتا ہوں، ان کے تسامحات کے حوالے سے نہیں۔

جن لوگوں نے میری کتاب تیسری روشنی پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ میں ایک فکری دریافت کے سفر سے گزرا ہوں۔ یہ فکری دریافت دیگر مذاہب اور افکار کے مقابلے میں اسلام کی سچائی کی دریافت بھی تھی اور خود مسلمانوں میں پائے جانے والے باہمی اختلافات میں قرآن مجید سے مطابقت رکھنے والی درست شاہراہ کی دریافت کا عمل بھی تھا۔

اس سفر میں تین بنیادی سوالات تھے جن کے جواب تلاش کرنا میرا مقصد تھا۔ ایک یہ کہ عقائد کے لحاظ سے جو اختلافات مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں ان میں درست نقطہ نظر کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ فقہی مسالک کی شکل میں جو مختلف گروہ پائے جاتے ہیں، ان میں کس کی رائے درست ہے۔ جبکہ تیسرا سوال یہ تھا کہ دین کے مقصد، حقیقت اور تعبیر کے لحاظ سے جو مختلف نظریات پائے جاتے ہیں، ان میں سے کون سا نقطہ نظر اسلام اور قرآن مجید کی درست ترجمانی کرتا ہے۔

دین کا بنیادی مقصد

صاحبان نظر یہ سمجھ سکتے ہیں کہ بیانیے کی موجودہ بحث اصلاً اسی تیسرے سوال سے متعلق ہے۔ اس بحث کے اگرچہ کئی پہلو ہیں لیکن اس کا مرکزی نقطہ اگر متعین کیا جائے تو وہ بنیادی طور پر ایک ہی ہے۔ دین اسلام ایک فرد کے سامنے کون سا نصب العین رکھتا ہے۔ دین کا وہ کون سا مقصد ہے جس کے حصول کے لیے دین کے باقی سارے احکام دیے گئے ہیں اور درحقیقت جس کے حصول یا حصول کی کوشش پر اخروی نجات موقوف ہے۔ یہی وہ بنیادی سوال ہے جس کے جواب سے پھر وہ سارے نکات پیدا ہو جاتے ہیں جو اِس وقت زیر بحث ہیں۔

اس بحث کا آغاز پچھلی صدی کی تیسری دہائی میں اس امت میں ایک جلیل القدر امام مولانا مودودیؒ کی اُس تعبیر دین سے ہوا تھا جسے دین کی سیاسی تعبیر کہا جا سکتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک بندہ مومن کی زندگی کا اصل مقصد حکومت الٰہیہ کے قیام کی جدوجہد کرنا ہے۔ عملی طور پر اس کا مطلب یہ تھا کہ دنیا کا اقتدار فاسقین کے ہاتھ سے چھین کر صالحین کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ یہ صالحین پھر سماج پر اللہ کا دین نافذ کریں گے اور ساتھ میں پوری دنیا سے ایک ''مصلحانہ جہاد'' کر کے ہر جگہ اسلام کا غلبہ قائم کریں گے۔ یہی وہ جدوجہد ہے جو ہر مسلمان پر

فرض ہے اور دین کا ہر حکم اسی بنیادی فریضے سے متعلق ہے۔ اس نقطہ نظر کی علمی اساسات حضرت مولاناؒ کی کتاب ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' اور ان کی بعض دیگر تصانیف میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ جبکہ ادبی اسلوب میں غالباً نعیم صدیقی صاحب نے بڑی خوبصورتی سے اس کو یوں بیان کیا تھا۔

میری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی

میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

مولانا مودودی کی خدمات

مولانا مودودیؒ بہت بڑے عالم اور محقق تھے۔ انھوں نے اپنے نقطہ نظر کو قرآن مجید کے تفصیلی دلائل کی بنیاد پر مرتب کیا تھا۔ وہ اعلیٰ درجہ کے ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ چنانچہ اپنی بات کے ابلاغ کی غیر معمولی صلاحیت ان میں تھی۔ اپنے نقطہ نظر کو معقول طریقے پر ثابت کرنے کی ان میں اتنی غیر معمولی قابلیت تھی کہ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندویؒ نے ان کو بیسوی صدی کے نصف اول میں اسلام کا سب سے بڑا متکلم قرار دیا تھا۔ چنانچہ اپنے نقطہ نظر کو بھی انھوں نے اسی بلاغت، جامعیت اور منطقی استدلال کے ساتھ پیش کیا تھا۔ پھر جس زمانے میں انھوں نے یہ نقطہ نظر پیش کیا، پورا عالم اسلام مغربی طاقتوں کی سیاسی غلامی کا شکار تھا۔ جو قوم ہزار برس تک دنیا کے اقتدار کی مالک رہی ہو، دور غلامی میں اس کی نفسیات سے یہ بات اتنی قریب تھی کہ گویا:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس پر مزید یہ کہ اس زمانے میں ہر جگہ کمیونزم کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ نظریہ اقتدار اعلیٰ پر قابض ہوکر سماج کو بدل دینے کا وہ طریقہ کار دیتا تھا جسے اُس زمانے کے انقلابی فکر میں بہت

مقبولیت حاصل ہوگئی۔ کمیونزم کے پیش کرنے والے مفکرین نے یہ کمال کیا تھا کہ انھوں نے انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک ایسا نقطہ نظر پیش کیا جو ایک سادہ بنیادی خیال یعنی سماجی ناہمواری کے خاتمے اور معاشی انصاف کے گرد گھومتا تھا۔ مگر اس کے پیچھے فلسفے، تاریخ، سیاست، معاشیات، سماجیات غرض ہر پہلو سے استدلال فراہم کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے نفاذ کے لیے ایک اقلیتی گروپ کو واضح پروگرام اور لائحہ عمل بھی دیا گیا کہ کس طرح حکومت پر قبضہ کر کے اپنا نقطہ نظر پورے سماج پر مسلط کرنا ہے۔ پھر اس انقلاب کو دنیا بھر میں پھیلانے کے لیے ایک پورا پروگرام اور اخلاقی توجیہ بھی دی گئی تھی۔ ان سب سے بڑھ کر حقیقتاً یہ انقلاب دنیا کے ایک بڑے ملک میں آ بھی گیا اور اس کی توسیع کا عمل شروع ہو گیا۔

اس چیز نے دنیا بھر کو ہلا کر رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ اُس دور کے مسلمان بھی اس سے بڑی شدت سے متاثر ہوئے۔ مگر کمیونزم کے لادینی پس منظر کی بنا پر ایک روایت پسند مسلمان ذہن کبھی کمیونزم کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ جو اسلامی نظریہ اس مقبول کمیونسٹ طریقہ کار کا ایک اسلامی متبادل دے سکے، اس میں اُس دور کے لحاظ سے بڑی کشش تھی۔ چنانچہ حکومت الٰہیہ کا نظریہ جس میں صالحین کی ایک جماعت جدوجہد کر کے اقتدار پر قبضہ کرنے اور پہلے پورے سماج کو بدل دینے اور پھر دنیا بھر پر اسلام کو غالب کر دینے کی علمبردار تھی، کمیونزم کا ایک بہت اچھا متبادل بن کر سامنے آئی۔

اس پہلو سے میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں جب کمیونسٹ انقلاب ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا اور کمیونسٹ پارٹی اور ترقی پسند تحریک کی شکل میں تیزی سے ہندوستان کے مسلمانوں میں اپنی جگہ بنا رہا تھا، ایسے میں مولانا مودودی کا کام ایک بہت بڑی خدمت تھا۔ مولانا مودودی نے ایک طرف اپنے مضامین میں (جن کا مجموعہ بعد میں ''تنقیحات''

کے عنوان سے شائع ہوا) مغربی فکر کے بڑھتے ہوئے اثرات پر زبردست چوٹ لگائی تو دوسری طرف کمیونزم کے مقابلے کے لیے اہل اسلام کو گویا اُس دور کا ایک بیانیہ دیا۔ آدھی دنیا میں پھیل جانے والا کمیونزم مذہب کے انکار کی بنیاد پر زندگی کا ایک نظریہ اور نظام دے رہا تھا جو بہت متاثر کن تھا۔ اس کے جواب میں اسلام کو اسی انداز سے پیش کر کے مولانا مودودی نے بہر حال بہت سارے لوگوں کو کمیونزم کی آغوش میں جانے سے بچایا اور اس وقت اسلام کا دفاع کیا جب فکری میدان میں اس کا دفاع کرنے والا کوئی نہ تھا۔

مولانا کے کام کی مزید عظمت اس وقت واضح ہوتی ہے جب اس کا تقابل جناب غلام احمد صاحب پرویز کے کام سے کیا جاتا ہے۔ پرویز صاحب نے اسی زمانے میں معاشی نظام یعنی نظام ربوبیت کو بنیاد بنا کر گویا دین کی ایک معاشی تعبیر دی تھی۔ یہ بھی کمیونزم کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے ایک جوابی بیانیہ تھا۔ مگر اس عمل میں خود قرآن کریم کے ساتھ جو کچھ انھوں نے کیا اس پر سب سے اچھا تبصرہ خود مولانا مودودی ہی نے کیا ہے کہ مختلف عربی لغات ہاتھ میں اٹھا کر وہ جو کچھ قرآن کریم کے ساتھ کرتے ہیں، کوئی شخص یہی کچھ اردو لغات اٹھا کر ان کی اپنی کتابوں کے ساتھ کرنا شروع کر دے تو وہ چیخ اٹھیں گے۔ اس کے برعکس مولانا کے کام کی یہ خصوصیت تھی کہ ان کا کام اتنی محکم بنیادوں پر کھڑا تھا کہ اس پر کسی قسم کی گرفت کرنا بہت مشکل تھا۔

اس نقطہ نظر پر اہم تنقیدیں

یہی وہ وجوہات تھیں کہ جن کی بنا پر اُس دور کے بڑے بڑے اذہان کو اُس فکر نے متاثر کیا۔ اور جو متاثر نہ ہوئے، وہ ان کی تردید میں بھی کچھ نہ کہہ سکے۔ چنانچہ مجدد وقت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ؒ جیسے بڑے عالم اور عارف کا حال یہ تھا کہ فرماتے تھے کہ (مفہوم جو

اس وقت مجھے یاد ہے) ان کی بات درست نہیں گرچہ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اس میں کیا غلط ہے۔ بہرحال آہستہ آہستہ یہ صورتحال ہوئی کہ مولانا مودودی کے فکر کو مسلمانوں کے بیشتر مذہبی فکری حلقوں بلکہ پورے عالم اسلام میں مقبولیتحاصل ہوگئی۔ یہاں تک کہ ان کے بدترین مخالفین اوران کے خلاف ''فتنہ مودودیت'' کی مہم چلانے والے طبقات بھی ان کی فکر کے سامنے سجدہ ریز ہوچکے ہیں۔ وہ ان ہی کی بولی بولتے اوران ہی کی تعبیر دین کے مختلف پہلوؤں کو اپنے انداز میں بیان کرتے ہیں۔

یہاں میں یہ عرض کردوں کہ میں اپنے ابتدائی فکری سفر میں مولانا مودودی کو اپنا سب سے بڑا محسن خیال کرتا ہوں جن کی تصانیف پڑھ کر میرے اندر اسلام پر اعتماد پیدا ہوا۔ اسی پس منظر میں میں ان کی تعبیرِ دین اوران کے نقطہ نظر کو بالکل درست خیال کرتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے مطالعے میں حضرت مولانا وحیدالدین خان صاحب کی کتاب ''تعبیر کی غلطی'' آئی۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں بہت واضح طریقے پر یہ ثابت کردیا کہ یہ نقطہ نظر اسلاف کی پوری علمی روایت کے خلاف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا وحیدالدین خان صاحب کی یہ کتاب مسلمانوں کے تنقیدی ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا مودودی کا کام جتنا بڑا اور جتنا مدلل تھا، یہ تنقید بھی اتنی اعلیٰ پائے کی ہے۔ سن 63ء میں یہ کتاب شائع ہوئی اور پھر سن 79ء میں یہی کام مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندویؒ نے ''عصر حاضر مین دین کی تفہیم وتشریح'' لکھ کر کردیا۔

غرض ان دونوں بزرگوں نے خالص علمی تنقید کرکے یہ بتادیا ہے کہ جن آیات اور اصطلاحات کی بنیاد پر یہ پورا نظریہ قائم کیا گیا ہے، وہ آیات کسی طور یہ بات بیان نہیں کرتیں۔ یہ سرتاسر ایک غلط فہمی ہے جو مولانا مودودیؒ کو لگ گئی تھی۔ تاہم یہ تنقیدیں صرف علمی حلقوں تک

محدود رہیں۔ بعد میں ان بزرگوں کی تنقید بس اِدھر اُدھر ہوکر رہ گئی اور سردست عالم اسلام پر مولانا مودودی کی فکر ہی کا غلبہ ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس فکر کی اصل طاقت یہ نہیں کہ اس کی علمی بنیادیں ناقابل تردید تھیں۔ بات دراصل یہ تھی اور ہے کہ یہ نقطہ نظر مسلمانوں کی نفسیات کے لیے بہت متاثر کن ہے۔ دوسروں کو چھوڑیں خود آج کے دن تک ہماری یہ شدید خواہش ہے کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کا غلبہ ہو اور اسلام غالب ہوجائے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب تک یہ تنقیدیں سامنے آئیں، مولانا کی تحریک عملاً ایک بہت بڑا حلقہ اثر قائم کرچکی تھی۔ علمی دنیا کے ساتھ سماج، سیاست اور صحافت میں اس کے بڑے اثرات ہوچکے تھے۔ پھر مولانا وحید الدین خاں صاحب اس زمانے میں بہت کم عمر (انھوں نے یہ کتاب 35 برس کی عمر میں لکھی تھی) نسبتاً غیر معروف شخص تھے۔ان کا اپنا کوئی حلقہ اثر تھا نہ علمی قد وقامت۔ اس لیے ان کی تنقید معاصر علمی حلقوں میں بھی وہ جگہ نہیں بنا سکی جس کی وہ مستحق تھی۔

چنانچہ مولانا کے افکار پھیلتے گئے اور ان کی فکر نے عالم عجم کے ساتھ عالم عرب کو بھی فتح کرلیا۔ حسن البناؒ، سید قطبؒ اور اخوان اپنے جذبات اور قربانیوں میں جس جگہ بھی کھڑے ہوں، فکر اور استدلال میں بہرحال وہ مولانا مودودیؒ ہی کے ممنون احسان ہیں۔ سردست اس وقت امت مسلمہ پر اس پہلو سے اگر کسی شخص کی فکری بادشاہی قائم ہے تو وہ ہمارے ممدوح حضرت مولانا مودودیؒ ہی کے نظریے کی حکومت ہے۔اور جیسا کہ عرض کیا ان کے بدترین مخالفین بھی آج ان ہی کی بولی بولتے ہیں۔ گرچہ نام مولانا کا نام نہیں لیتے نہ ان کو کوئی کریڈٹ دیتے ہیں۔

دین کی سیاسی تعبیر کے لیے لفظ خلافت کا نعرہ

مولانا مودودی کے نظریات نے گرچہ مسلمانوں کے مذہبی فکری طبقات کو فتح کرلیا ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ عوام الناس میں ان کی فکر کو کوئی بہت زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی۔ ان

کی فکر عوامی تحریک میں تبدیل نہ ہوسکی۔ دوسری طرف مولانا نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کمیونسٹوں کے انقلابی طریقہ کار کو چھوڑ کر جمہوری طریقے کو نہ صرف اختیار کرلیا بلکہ سورہ شوریٰ میں آیت ''امرھم شوری بینھم'' کی تفسیر کرتے ہوئے قرآن مجید سے اس کے دلائل بھی فراہم کردیے۔ اس تبدیلی سے مولانا کے فکر کی اخلاقی حیثیت بہت بلند ہوگئی، گرچہ فوری طور پر ان کی جماعت کو کامیابی نہ مل سکی۔ مگر اس کی وجہ اس طریقے کی غلطی نہیں بلکہ جماعت کا یہ مسئلہ ہے کہ وہ پاکستان اور پاکستانیوں کے مسائل کی سیاست کرنے کے بجائے زیادہ زور اپنے آفاقی ایجنڈے پر دیتی ہے۔ میری پختہ رائے ہے کہ پاکستان کی جماعت اسلامی بھی اگر اپنے آفاقی ایجنڈے کو ایک کونے میں رکھ کر صرف پاکستان اور پاکستانیوں کی سیاست شروع کردے تو آج بھی پاکستان کا معاشرہ کسی صالح اور کرپشن سے بلند قیادت کا منتظر ہے۔ جو کچھ ترکی میں ہو رہا ہے پاکستان میں بھی ہوسکتا ہے۔ کاش جماعت کے دوست یہ حقیقت سمجھ سکیں۔ بہرحال دنیا بھر میں اہم اسلامی تحریکوں نے جیسے ترکی اور مصر میں مولانا مودودی کی پیروی میں جمہوری طریقے سے جدوجہد کی اور آفاقیت سے کہیں زیادہ زور مقامی مسائل پر دیا۔ یوں وہ آخر کار اقتدار تک پہنچ گئیں۔ خیر یہ الگ موضوع ہے جس پر کبھی بعد میں تفصیل سے لکھوں گا۔

تاہم بہت سے لوگ تھے جنھوں نے طریقہ کار کی اس تبدیلی کو قبول نہیں کیا۔ بلکہ وہ اور شدت کی طرف چلے گئے۔ خاص طور پر عرب آمریتوں نے اخوان کے ساتھ جو سختی کی اس کے ردعمل میں یہ مزید انتہا پسند ہوتے چلے گئے۔ ان میں سے ایک جماعت حزب التحریر تھی۔ اس نے اپنے سیاسی نصب العین کے لیے ''خلافت'' کے نعرہ کو اختیار کرلیا۔ اس نعرے کی علمی اور دینی قدر و قیمت تو ابھی زیر بحث آجاتی ہے، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ''خلافت'' کی اصطلاح کا نفسیاتی اثر ایک عام مسلمان کے لیے بہت زیادہ ہے۔ خلافت کا لفظ سنتے ہی ایک طرف سیدنا ابوبکر و عمر رضی

اللہ تعالیٰ عنہما کی درویشانہ حکومت ذہن میں آتی ہے جس میں شیر اور بکری ایک گھاٹ میں پانی پیتے تھے تو دوسری طرف مسلمانوں کا ہزار سالہ اقتدار اور غلبہ یاد آ جاتا ہے۔ عرب میں اس فکر کو حزب التحریر جیسی جماعتوں نے اور ہمارے ہاں اس فکر کو ڈاکٹر اسرار مرحوم نے بہت عام کیا۔ اس خاکسار کو یہ شرف حاصل ہے کہ جس زمانے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے تحریک خلافت کا باقاعدہ آغاز کیا، یہ عاجز دن رات ان تمام اجتماعات اور تقریروں میں شریک ہو کر براہ راست وہ استدلال سمجھتا رہا ہے جو ڈاکٹر صاحب مرحوم پیش فرما رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی عوامی اپیل حکومت الٰہیہ کے نعرے سے کہیں زیادہ ہے اور الحمد اللہ ثم الحمد للہ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔

خلافت کے حوالے سے قرآن مجید کا نقطہ نظر

المیہ البتہ یہ ہے کہ اس پورے معاملے میں کوئی اللہ میاں سے پلٹ کر پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ وہ خود کیا فرماتے ہیں۔ شاید حضرت اقبال کے اثر سے ہماری خودی اتنی بلند ہو چکی ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ خدا بندے سے خود پوچھتا رہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔ بندے کا اب یہ کام نہیں رہا کہ وہ خدا کی رضا بھی دریافت کرنے کی کوشش کرے۔ اس عاجز نے ابھی تک اس مضمون میں جو کچھ لکھا ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ اس حوالے سے کم از کم اللہ تعالیٰ کی مرضی و منشا سے ان ہی کے الفاظ میں لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ کیونکہ بیانیے کی اس بحث میں خلافت کے حوالے سے جو کچھ پڑھنے کا موقع ملا ہے، اس کے بعد میں اسے اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کا نقطہ نظر ان کے اپنے الفاظ میں لوگوں کے سامنے رکھ دوں۔ تا کہ قیامت کے دن کوئی عالم و عامی رب کے حضور یہ نہ کہہ سکے کہ اللہ میاں! سب اپنی باتیں کرتے رہے، آپ کی بات تو کسی نے بتائی ہی نہیں۔

ذیل میں قرآن مجید میں خلافت کے موضوع کو زیر بحث لانے والی تمام آیات کا ترجمہ نقل کیا جارہا ہے۔اس میں لفظ خلیفہ کو بعینہٖ بغیر کسی ترجمے کے نقل کیا ہے۔اس کا جو دل چاہے آپ ترجمہ کرلیں۔نتائج فکر کسی طور مختلف نہیں ہو سکتے۔وہ نتائج کیا ہیں، ملاحظہ فرمائیے۔

پہلا یہ کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی مقام پر بھی مجھ سے، آپ سے یا کسی سے بھی یہ نہیں کہہ رہے کہ تم خلافت قائم کرنے کی جدو جہد کرو۔یا یہ کوئی دینی کام ہے۔یا یہ کہ یہ سرے سے کوئی کرنے کا کام ہے۔ظاہر ہے کہ اگر کوئی چیز دین کا مطالبہ یا دین کا مقصد ہے تو اس کا حکم دیا جانا تو ضروری ہے نا۔اس کے بغیر اس کام کے لیے لوگوں کو کس بنیاد اٹھایا جاسکتا ہے؟

دوسرا یہ کہ اس کے بالکل برعکس ہر مقام پر اللہ تعالیٰ افراد اور اقوام کو خلیفہ بنانے کے عمل کو سرتا سر اپنی طرف منسوب کررہے ہیں۔یعنی قرآن مجید ہر جگہ اسے ایک تکوینی امر کے طور پر پیش کرتا ہے۔یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ آسمان وزمین کے دیگر معاملات کررہے ہیں؛ مثلاً لوگوں کو زندہ کرتے ہیں، مارتے ہیں، رزق دیتے ہیں، اولاد دیتے ہیں، بیکس کی فریادرسی کرتے ہیں، اسی طرح وہ خلافت کے متعلق بھی واضح کررہے ہیں کہ لوگوں کو خلافت وہی دیتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ جس معاملے کو اللہ تعالیٰ ایک تکوینی (اللہ کی قدرت سے متعلق) معاملہ قرار دے رہے ہیں، اس کو تشریعی (شریعت کے حکم سے متعلق) معاملہ کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ جو اللہ کے کرنے کا کام ہے، وہ ایک دینی فریضہ کیسے بن سکتا ہے؟

تیسرے یہ کہ کئی مقامات پر یہ صراحت کی گئی ہے کفار کو بھی زمین پر خلیفہ بنایا گیا ہے۔کفار قریش، قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود سب کے متعلق یہ تصریح ہے کہ ان کو زمین پر خلیفہ بنایا گیا۔سوال یہ ہے کہ اگر ان کفار کو بھی خلیفہ بنایا گیا تو اس معاملے کو مسلمانوں کے ساتھ کیسے خاص کیا جاسکتا ہے؟

چوتھی بات یہ ہے کہ جس جگہ پر مسلمانوں کو خلیفہ بنانے کا ذکر ہے، وہاں اسے مسلمانوں کے کسی مقصد کے طور پر بیان نہیں کیا گیا بلکہ یہ اللہ کے وعدے کا بیان ہے کہ جو لوگ ایمان و عمل صالح کی شرط پر پورا اتریں گے، یہ ان سے اللہ کا وعدہ ہے۔سوال یہ ہے کہ امر موعود کو امر مقصود کیسے بنایا جا سکتا ہے۔یعنی جو اللہ کا وعدہ ہے وہ اللہ پورا کریں گے۔ہمیں تو جو کام بتایا گیا ہے یعنی ایمان و عمل صالح ہمیں تو لوگوں کو اس کے لیے اٹھانا چاہیے۔نہ کہ خلافت کے کسی نظریے کو مقصود دین کے طور پر پیش کرنے لگیں۔

پانچویں اور آخری بات یہ ہے کہ یہ کسی فقہی امر کو متعین کرنے کا معاملہ نہیں جس میں فقہا کے اقوال نقل کر کے قوم کو اس کے پیچھے دوڑا دیا جائے۔ یہ دین کے نصب العین کا معاملہ ہے۔یہ ایک دینی فریضے کا معاملہ ہے۔اس پر قرآن مجید کی واضح ترین صراحت چاہیے۔ہم یہ بتا چکے ہیں کہ نہ صرف قرآن مجید اسے کسی دینی فریضے کے طور پر بیان نہیں کرتا بلکہ ہر پہلو سے اس کے متضاد بات کرتا ہے۔ایسے میں ہماری ناقص رائے میں قرآن مجید اس نقطہ نظر کے بالکل خلاف کھڑا ہوا ہے۔اب ذرا آیات الٰہی کا مطالعہ فرمالیجیے۔

آیات قرآنی

''(کیا تمھارے یہ شرکاء عبادت کے مستحق ہیں) یا وہ جو محتاج کی دادرسی کرتا ہے، جبکہ وہ اس کو پکارتا ہے اور اس کے دکھ درد دور کرتا ہے اور تم کو زمین کا خلیفہ بناتا ہے۔''، (النمل 62:27)

اور ہم نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کیا جب کہ وہ ظلم کی مرتکب ہوئیں۔اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور وہ ایمان لانے والے نہ بنے۔ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں مجرم قوم کو۔پھر ہم نے ان کے بعد تم کو زمین کا خلیفہ بنایا تا کہ دیکھیں تم کیسا عمل کرتے ہو۔

(یونس 10:14-13)

وہی ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو جو کفر کرے گا اس کے کفر کا وبال اسی پر آئے گا اور

کافروں کے لیے ان کا کفر، ان کے رب کے نزدیک، اس کے غضب کی زیادتی ہی کا موجب ہوگا۔ اور کافروں کے لیے ان کا کفران کے خسارے ہی میں اضافہ کرے گا۔ (فاطر 35 :39)

(حضرت ہود نے اپنی قوم عاد سے کہا) اور یاد کرو جب کہ اس نے تمہیں قوم نوح کے بعد خلیفہ بنایا اور جسمانی اعتبار سے تمہیں وسعت وکشادگی عطا فرمائی تو اللہ کی شانوں کو یاد رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

(الاعراف 7 :69)

(حضرت صالح نے اپنی قوم ثمود سے کہا) اور یاد کرو جب کہ خدا نے قوم عاد کے بعد تم کو خلیفہ بنایا اور ملک میں تم کو تمکن بخشا، تم اس کے میدانوں میں محل تعمیر کرتے اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو تو اللہ کی شانوں کو یاد کرو اور ملک میں اودھم مچاتے نہ پھرو۔ (الاعراف 7 :76)

اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا اور ایک کے درجے دوسرے پر بلند کیے تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے اس میں تم کو آزمائے، بے شک تیرا رب جلد پاداش عمل دینے والا بھی ہے اور وہ بخشنے والا اور مہربان بھی ہے (الانعام 6 :165)

اور تیرا رب بے نیاز، رحمت والا ہے، اگر وہ چاہے تم کو فنا کر دے اور تمہارے بعد تمہاری جگہ جس کو چاہے خلیفہ بنا دے جس طرح اس نے تم کو پیدا کیا دوسروں کی نسل سے۔ (الانعام 6 :133)

پس اگر تم اعراض کر رہے ہو تو میں نے تمہیں وہ پیغام پہنچا دیا جو دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا ہے۔ اور میرا رب تمہاری جگہ اب تمہارے سوا کسی اور قوم کو خلیفہ بنائے گا اور تم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے۔ میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔ (ہود 11 :57)

اور یاد کرو جب کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، انہوں نے کہا کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خونریزی کرے۔

(البقرہ 2 :30)

''اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ پس لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلہ

کرو۔''، (ص 38:26)

تو انہوں نے اس (نوح) کو جھٹلا دیا تو ہم نے اس کو اور جو لوگ اس کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دی اور ان کو خلیفہ بنا دیا اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تو دیکھو کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جن کو ہوشیار کیا جا چکا تھا!! (یونس 10 :73-71)

وہ بولے ہم تو تمہارے آنے سے پہلے بھی ستائے گئے اور تمہارے آنے کے بعد بھی۔ (موسیٰ) نے کہا توقع ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو پامال کرے گا اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے گا کہ دیکھے تم کیا روش اختیار کرتے ہو! (اعراف 7 :129)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے عملِ صالح کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک میں خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان لوگوں کو خلیفہ بنایا جو ان سے پہلے گزرے اور ان کے اس دین کو متمکن کرے گا جس کو ان کے لیے پسندیدہ ٹھہرایا اور ان کی اس خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو درحقیقت وہی لوگ نافرمان ہیں۔ (نور 24 :55)

یہ قرآن مجید میں خلافت کے حوالے سے آنے والے کل بیانات ہیں جو بعینہٖ آپ کے سامنے ہیں۔ ان آیات کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔ آپ ایک لمحے میں یہ جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مقام پر خلیفہ بنانے کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ اسے کسی دینی فریضے کے طور پر نہیں بلکہ بطور آزمائش یا بطور انعام بیان کیا گیا ہے۔ یہ خلافت اہل ایمان کو دینے کا بیان ہے تو کفار کو بھی دیے جانے کا ذکر ہے۔

ان آیات سے یہ بات آخری درجہ میں واضح ہے کہ اس سے خلافت قائم کرنے کی کسی جدوجہد پر اٹھانے کا کوئی اشارہ نہیں۔ ایسا کوئی دینی حکم نہیں کہ خلافت قائم کرنے کی جدوجہد کرو۔ بلکہ اس کے برعکس اسے ایک تکوینی معاملے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ یعنی یہ اللہ کا فیصلہ

ہے۔اس میں کسی کا کوئی عمل دخل نہیں۔زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو ایمان صالح کی بنیاد پر خلافت کی خوش خبری دیتے ہیں۔چنانچہ ہمارے حوالے سے اگر کوئی نتیجہ نکلتا ہے تو وہ یہ نکلتا ہے کہ ایمان وعمل صالح کی وہ تحریک برپا کریں جس کے لیے اس خاکسار نے اپنی زندگی وقف کی ہے۔یہ کیفیت اگر پیدا ہوگئی تو اللہ تعالیٰ خلافت عطا کردیں گے۔کیونکہ سورہ نور کی آیت نص قطعی ہے کہ یہ امر مقصود نہیں امر موعود ہے۔یعنی یہ دین کا کوئی حکم نہیں بلکہ دین پر پوری طرح عمل کرنے کا انعام ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

قرآن نے یہی بات خلیفہ کا لفظ استعمال کیے بغیر بھی بیان کی ہے۔سورہ اٰل عمران میں جس مقام پر اس فیصلہ الٰہی کا اعلان ہورہا ہے کہ یہود کو منصب امامت سے معزول کیا جارہا ہے اور بنی اسماعیل کو اس منصب پر فائز کیا جارہا ہے وہاں یہ فیصلہ ایک دعا کی شکل میں امت کو سکھایا گیا ہے۔اس دعا میں خلافت کی جگہ بادشاہی کے الفاظ استعمال کر کے ٹھیک یہی بات بتادی گئی ہے۔

دعا کرو، اے اللہ، بادشاہی کے مالک، تو ہی جس کو چاہے بادشاہی دے، جس سے چاہے بادشاہی چھینے اور تو ہی جس کو چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلت دے، تیرے ہی ہاتھ میں خیر ہے۔بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔تو، رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور ظاہر کرتا ہے زندہ کو مردہ سے اور ظاہر کرتا ہے مردہ کو زندہ سے اور تو جس پر چاہتا ہے اپنا بے حساب فضل کرتا ہے۔(آل عمران 3: 27-26)

دیکھ لیجیے کہ یہاں بھی بادشاہی دینے اور لینے کو ایک تکوینی معاملے یعنی فیصلہ الٰہی کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔اہل ایمان کو اس مقصد کے لیے کسی جدوجہد کا حکم نہیں دیا گیا۔ بلکہ اسے دیگر تکوینی معاملات کے ساتھ بطور قدرت الٰہی کے بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے کسی قسم کی سیاسی جدو جہد کر کے حکومت قائم کرنا کس طرح دین کا کوئی مطالبہ بن سکتا ہے۔ایک دوسری جگہ خلافت کا

ایک دوسرا اہم معنی لفظ یعنی تمکن فی الارض یا زمین پر اقتدار بخشنا کے الفاظ سے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ اقتدار دے۔

یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ اور انجام کار کا معاملہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ (الحج 22: 41)

یہ ہے اس معاملے قرآن مجید کا نقطہ نظر جو ہم نے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ ہمارا مقصود کسی کو فکری شکست دینا نہیں، اللہ کی مرضی کو کھول کر بیان کرنا ہے۔ تا کہ کل قیامت کے دن لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ پروردگار کسی نے آپ کی بات سمجھائی ہی نہیں۔ ہمیں کسی بحث میں نہیں الجھنا، صرف لوگوں سے یہ گواہی چاہیے کہ ہم نے اپنے رب کی بات بعینہٖ ان کے سامنے رکھ دی ہے۔ اب جس کا دل چاہے وہ مانے اور جس کا دل چاہے نہ مانے۔

دین کا نصب العین: قرآن مجید کے الفاظ میں

اس ضمن میں ایک آخری سوال جس کا مختصر جواب دے کر ہم یہ گفتگو ختم کریں گے وہ یہ ہے کہ پھر دین اپنا نصب العین کیا بیان کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس معاملے میں درست بات وہی ہے جو حضرت الاستاذ جناب جاوید احمد صاحب غامدی نے قرآن مجید کی روشنی میں بیان کی ہے۔ یعنی دین ایک فرد کے سامنے یہ مقصد رکھتا ہے کہ وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے۔ قرآن مجید جگہ جگہ اسی تزکیہ پر جنت کی کامیابی کو موقوف قرار دیتا ہے۔ اسی کو چار مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقصد کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

کامیاب ہوا وہ جس نے اپنا تزکیہ کیا اور اپنے پروردگار کا نام یاد کیا، پھر نماز پڑھی۔ (الاعلیٰ 87:14-15)

’’قسم ہے نفس انسانی کی اور جیسا کہ اسے ٹھیک بنایا۔ پھر اس کی بدی اور تقویٰ اسے الہام کیا، کامیاب ہوا وہ جس نے اس نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا جس نے اسے آلودہ کیا‘‘ (الشّمس91:10-7)

’’وہی ذات ہے جس نے اِن امیوں میں ایک رسول اِنھی میں سے اٹھایا ہے جو اُس کی آیتیں اِن پر تلاوت کرتا ہے اور اِن کا تزکیہ کرتا ہے اور (اِس کے لیے) اِنھیں قانون اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔‘‘ (جمعہ 2:62)

یہی تزکیہ یعنی عقیدے، عمل اور اخلاق کی ہر آلائش سے خود کو پاک کرنے کا وہ عمل ہے جو ایک مومن کی زندگی میں ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ تمام احکام دین اسی مقصد کے حصول کے لیے دیے گئے ہیں۔ یہی وہ تزکیہ ہے جو جنت میں داخلے کی اصل وجہ ہے، (طہ 20:76) اور قرآن مجید کے مطابق اس میں کوئی کمی رہ گئی تو اللہ تعالیٰ اسے پورا کر دیں گے اور نافرمانوں کو اس سے محروم رکھیں گے۔ (بقرہ 2:174)۔

ہمارے نزدیک دور جدید کی سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ لوگوں نے اپنی ذات کے تزکیے کو چھوڑ کر خارج میں دوسروں پر دین نافذ کرنے اور ان پر زبردستی اسلام کو ٹھونسنے کو اصل دین بنا دیا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید بالکل واضح ہے کہ دوسروں کے حوالے سے ذمہ داری صرف پہنچانے اور سمجھانے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس دنیا کے بارے میں یہ اسکیم ہی نہیں کہ لوگوں کو زبردستی نیک بنایا جائے۔ اسے تو اپنی جنت کے لیے ایسے لوگ چاہئیں جو زبردستی اور منافقانہ طور پر نہیں بلکہ دلیل کی بنیاد پر ایمان لا کر اپنے اختیار کو خدا کے سامنے ختم کر دیں۔ وہ کسی جبر کے بغیر نیک بن جائیں۔ اگر بالجبر لوگوں سے سچائی منوانی اور اچھے کام کروانے ہوں تو اللہ تعالیٰ کا ایک اشارہ ہوگا اور دنیا میں کوئی نافرمان نہ رہے گا۔ مگر پھر امتحان بھی نہیں رہے گا۔

یہ دنیا دارالامتحان ہے۔اس میں خیر وشر کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔چنانچہ اسی خیر وشر کے شعور کو زندہ رکھنے کے لیے ہدایت،شہادت حق،تواصوابالحق،امر بالعروف ونہی المنکر ،انذار وتذکیر کا پورا سلسلہ برپا کیا گیا ہے۔ڈرانا دھمکانا، جبر اور زبردستی اللہ کی اسکیم نہیں۔یہی اصل بات ہے جو ہم کو سمجھ لینا چاہیے کہ جبر اللہ کی اسکیم کا حصہ نہیں۔اسی کی روشنی میں دین کے ہر حکم کو سمجھنا چاہیے۔

اس حوالے سے لوگوں میں کچھ غلط فہمیاں ہیں۔مگر یہ مضمون بہت طویل ہو چکا ہے۔اس لیے ہم مضمون کو یہیں ختم کر کے ان کے حوالے اپنا نقطہ نظر تین مزید مضامین میں اگلے صفحات پر بیان کریں گے۔پہلے میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر گفتگو ہوگی۔دوسرے میں سرزمین عرب پہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کو حاصل ہونے والے غلبے اور مشرکین عرب کے لیے سزائے موت کے قرآنی حکم کی وضاحت ہوگی۔تیسرے میں خلافت راشدہ میں روم وایران کے خلاف کیے جانے والے جہاد پر گفتگو کی جائے گی۔یہ مضامین آپ آگے ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

جہاں رہیں بندگان خدا کے لیے باعث رحمت بنیے ،باعث آزار نہ بنیے۔

بہترین انسان کون ہے اس کا فیصلہ
بد ترین حالات کیا کرتے ہیں
اسی لیے بہترین لوگ
بدترین حالات سے گھبرایا نہیں کرتے (ابویحییٰ)

ابو یحییٰ

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

جنت وہ مقام ہے جہاں اللہ کے پسندیدہ لوگ ہمیشہ اللہ کی نعمتوں میں جئیں گے۔ یہ جنت درحقیقت اس بات کا بدلہ ہے کہ انسانوں نے تمام تر اختیار کے باوجود اپنے اختیار اور آزادی سے ہر اس جگہ دستبرداری اختیار کر لی جہاں اللہ کا حکم آ گیا۔ اپنے جذبات، خواہشات اور تعصّبات کو بغیر کسی خارجی دباؤ کے صرف اللہ کی رضا کے لیے قربان کر دیا۔

مثلاً ایک نوجوان کے لیے اس میں بڑی کشش ہوتی ہے کہ وہ بدکاری کا ارتکاب کرے۔ مگر موقع ملنے پر بھی جب وہ یہ کام صرف اللہ کی رضا کے لیے نہیں کرتا تو خود کو جنت کا مستحق بنا لیتا ہے۔ مگر اس کے برعکس ایک شخص جو باجماعت نماز ادا کرے مگر اس کی منشا لوگوں میں نیکی کا تاثر دینا ہو تو ایسا شخص ریاکاری کے جرم میں جہنم کا ایندھن بنے گا۔

یہی جنت کے حصول کا بنیادی فلسفہ ہے۔ اللہ کی مرضی کے آگے اپنی مرضی کو چھوڑ دو۔ اور اللہ کی بندگی صرف اللہ کی رضا کے لیے اختیار کرو نہ کہ دوسروں کو دکھانے یا ان کے ڈر سے نیکی کے کام کرو۔ دین اسلام کے تمام احکام اسی بنیادی فلسفے کے تحت دیے گئے ہیں۔ البتہ دین کے چند احکام ایسے ہیں جو بظاہر اس بنیادی فلسفے کے خلاف لگتے ہیں۔ تاہم ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ان احکام کو جیسے ہی درست زاویے سے دیکھا جاتا ہے چیزیں واضح ہو جاتی ہیں۔

ان احکام میں سب سے بنیادی حکم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ یہ کر دیا جاتا ہے کہ نیکی کا حکم دیا جائے اور برائی سے روکا جائے۔ پھر اس کی جو تشریح کی جاتی ہے، اس سے دین کے اس بنیادی فلسفے کی نفی ہو جاتی ہے جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ یعنی لوگ اپنے اختیار، اپنی مرضی سے دین پر عمل کریں۔ اس کے برعکس دین کو اس طرح پیش کیا جاتا

ہے کہ گویا یہاں ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ زبردستی لوگوں پر دین ٹھونسے اور جہاں کسی برائی کو دیکھے زبردستی لوگوں کو اس سے روک دے۔

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے حکم میں لازماً یہ بات شامل نہیں کہ دوسروں پر زبردستی دین ٹھونسا جائے بلکہ جس طرح یہ عربی زبان میں حکم دینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح یہ سمجھانے، خیال ڈالنے، توجہ دلانے، مشورہ دینے اور بجھانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جو لوگ عربی ادب سے اس کی مثالیں دیکھنا چاہیں وہ مولانا اصلاحی کی تدبر قرآن (1/410) میں اس کی مثالیں دیکھ سکتے ہیں۔ تاہم خود قرآن مجید اپنے طریقے پر جگہ جگہ اسی مفہوم کو بالکل واضح کر دیتا ہے۔

مثال کے طور پر شیطان کے متعلق بیان ہوا ہے کہ وہ برائی اور فواحش کا 'امر' کرتا ہے، (البقرہ169:2)۔ تاہم قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے بالکل واضح ہے کہ شیطان کا یہ امر یا حکم دراصل اس کی دعوت، (ابراہیم22:14) یا پھر اس کی وسوسہ انگیزی، (الناس5:114) ہے۔ یہی معاملہ 'نہی' کا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ نماز فواحش اور منکر سے روکتی ہے، (العنکبوت45:29)۔ اس آیت میں 'نہی' کے لفظ کو نماز سے منسوب کر کے قرآن مجید نے لفظ کے اس پہلو کو بالکل کھول دیا ہے۔ ظاہر ہے نماز زبردستی کسی سے کوئی کام نہیں کرا سکتی بلکہ مراد یہ ہے کہ نماز انسان میں یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ وہ رب کا بندہ ہے۔ اگر نماز کے اندر ہے تو پھر نماز سے باہر بھی اسے چاہیے کہ وہ نافرمانی، فواحش اور منکر سے رکے۔ یہی معاملہ شیطان کا ہے کہ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ ہاتھ پکڑ کر کسی سے کوئی برائی نہیں کراتا بلکہ برائی کا خیال دل میں ڈالتا ہے۔ اس سے زیادہ اس کا کوئی اختیار نہیں۔

قرآن مجید میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم اسی پس منظر میں بیان ہوا ہے کہ جس

طرح شیاطین اپنا کام مسلسل سرانجام دے رہے ہیں اور لوگوں بہکاتے رہتے ہیں، اسی طرح اہل ایمان کو اپنے اطراف کے خیر وشر سے بے نیاز نہیں ہونا چاہیے بلکہ جہاں برائی ہو، اس سے لوگوں کو روکنا اور نیکی کی طرف بلانا چاہیے۔ زبردستی لوگوں پر دین ٹھونسنا، ان کو مجبور کرنا یہ کسی طور اس حکم کا تقاضہ نہیں۔ قرآن مجید ایک دوسرے مقام پر اس حوالے سے مسلمانوں کی حدود اس طرح واضح کرتا ہے۔

اے ایمان والو! اپنی فکر رکھو، اگر تم ہدایت پر ہو تو کسی دوسرے کی گمراہی تمھارا کچھ نہیں بگاڑے گی۔ تم سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے، پھر وہ تم کو بتادے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو، (المائدہ 105:5)۔

تاہم یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہم میں سے ہر شخص کا ایک دائرہ اختیار بھی ہوتا ہے۔ وہاں زبانی کلامی سمجھانا ہماری ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بعض اوقات یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ برائی سے بالجبر روکا جائے اور نیکی پر پورے اہتمام سے ابھارا جائے۔ قرآن وحدیث کی بعض باتیں درحقیقت اسی دائرے سے متعلق خاص ہیں جن کو غلط فہمی کی بنیاد پر عام کر کے اسے دین کا مطالبہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ زبردستی لوگوں پر اچھائی اور برائی مسلط کی جائے۔ حالانکہ ایسے احکام کا تعلق صرف ان کے دائرہ اختیار سے ہے۔

مثلاً قرآن مجید میں حکمرانوں کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے۔ عام حالات میں اس کے لیے دعوت وتلقین کا طریقہ ہی اختیار کیا جائے گا۔ تاہم بعض جگہ پر قانون کی طاقت استعمال کرنا ناگزیر ہوتا ہے اور حکمران یہ طاقت استعمال نہیں کریں گے تو فساد پھیل جائے گا۔ چنانچہ اسی اصول پر خود اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ وہ قتل، زنا، چوری وغیرہ جیسے جرائم کی سزا دیں۔ مگر ان سب احکام کا تعلق دائرہ اختیار سے ہے۔ ایک قاتل کو قتل کرنا ضروری ہے۔ مگر یہ

ایک عام آدمی کا دائرہ اختیار نہیں ہے کہ وہ قاتل کو قتل کرے۔ یہ حکمران کا کام ہے۔

یہی معاملہ ایک باپ یا ماں کا ہے جس کی اولاد اس کا دائرہ اختیار ہے۔ انہیں تلقین سے آگے بڑھ کر بچوں کو برائی سے روکنا اور نیکی پر ابھارنا چاہیے۔ اپنے بچوں کی برائی کو دل میں برا سمجھنا یا زبانی سمجھا دینا کافی نہیں، والدین کو اس سے آگے بڑھ کر قدم اٹھانا ہوتا ہے۔ تاہم اس کا کوئی تعلق دوسروں کے ساتھ نہیں کہ آپ نے اگر انھیں زبردستی برائی سے نہیں روکا تو آپ ایمان کے پہلے درجے سے پھسل کر دوسرے تیسرے درجے پر آجائیں گے۔ دین ایسے غیر فطری مطالبات نہیں کیا کرتا۔

دین اسلام دین فطرت ہے۔ اس کا ہر مطالبہ عقلی اور فطری ہے۔ اس کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ لوگ اپنی مرضی اور خوشی سے اللہ کی بندگی کریں اور خود کو جنت کا حقدار ٹھہرائیں۔ تاہم یہ بھی ایک عقلی اور فطری تقاضہ ہے کہ معاشرے میں خیر وشر کا تصور زندہ رکھا جائے اور مسلمہ برائیوں سے روکا جائے اور مسلمہ نیکیوں کی طرف بلایا جائے۔ دین کا ہر شخص سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ اپنے اپنے دائرہ اثر میں یہ کام کریں۔ البتہ اپنے دائرہ اختیار میں دین یہ عقلی وفطری مطالبہ کرتا ہے کہ برائی سے عملاً روکا جائے اور نیکی پر پوری طرح ابھارا جائے۔ یہ نہیں کیا جائے گا تو معاشرہ ظلم اور فساد سے بھر جائے گا۔ یہ دین اسلام کے حکم امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو دیکھنے کا درست زاویہ ہے۔

رسول اور ان کی اقوام

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ فرشتوں نے اپنے رب کے حکم کی پیروی کی مگر ایک جن ابلیس نے اللہ

کی بات ماننے سے انکار کردیا۔ ابلیس اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے سرکشی پر اڑ گیا اور اللہ تعالیٰ سے اس بات کی مہلت مانگی کہ وہ انسانوں کو گمراہ کرسکے۔ چنانچہ اس کو یہ مہلت دے دی گئی۔ مگر یہ بات واضح کردی گئی کہ اس کو انسانوں پر کسی قسم کا اختیار نہیں کہ وہ ان کو زبردستی برائی کی طرف لے کر جائے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر یہ بات بیان ہوئی ہے۔ مثلاً (ابراہیم: 22، اسراء: 65، الحجر: 42) وغیرہ۔

چنانچہ شیاطین انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے جو راستہ اختیار کرتے ہیں وہ وسوسہ انگیزی کرنے کا ہے۔ چنانچہ یہی وہ ذریعہ ہے جس کو استعمال کرکے شیاطین ہر دور میں انسانوں کو گمراہ کرتے رہے ہیں۔ البتہ قرآن مجید کے ایک مقام سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو ان لوگوں پر اختیار حاصل ہوجاتا ہے جو شیطان کو اپنا دوست بنالیں اور جو مشرک ہوجائیں، (النحل 100)۔ چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے انھی مشرکین کو استعمال کرکے اللہ تعالیٰ کی اس اسکیم پر زد لگانے کی کوشش کی جس میں اس نے ہر انسان کو یہ آزادی دی تھی کہ حق آنے کے بعد جو چاہے مومن ہوجائے اور جو چاہے وہ کافر بن جائے۔ الکہف 29۔

تاریخ میں اس کی عملی شکل یہ ہوئی کہ پوری کی پوری اقوام دین شرک کی پیرو بن گئیں۔ وہ کسی انسان کو یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں تھیں کہ وہ ایک اللہ کی عبادت کرے۔ کوئی یہ کوشش کرتا تو اس کو قتل کردیا جاتا یا دیگر عذابوں سے گزارا جاتا۔ یہ صورتحال اللہ تعالیٰ کے لیے ناقابل قبول تھی۔ چنانچہ اس نے مختلف اقوام میں اپنے پیغمبروں کو حق کے ساتھ بھیجا۔ ان پیغمبروں کا یہ مشن تھا کہ وہ قوم کو حق کی دعوت دیں۔ قوم کے کفر پر اسے صفحہ ہستی سے مٹانے کا فیصلہ کرلیا جاتا۔ جب کہ ماننے والوں کو زمین پر غلبہ و اختیار دے دیا جاتا۔ گویا پیغمبر کے یہ ساتھی جو عذاب سے بچا لیے جاتے، انسانی تاریخ کا نئے سرے سے آغاز کرتے جہاں کسی قسم کا مذہبی جبر نہ ہوتا۔

چنانچہ قوم نوح، عاد، ثمود، قوم ابراہیم، قوم لوط اور قوم شعیب علیھم السلام کو اسی اصول پر ہلاک کیا گیا اوران کے ماننے والوں کو زمین پر بسا دیا گیا۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی اور رسول تھے۔ آپ کو اپنی قوم یعنی عرب کے بنی اسماعیل میں اِسی مشن کے ساتھ بھیجا گیا۔ یہ وہ قوم تھی جس نے شرک کو بطور دین اختیار کرلیا تھا۔ قرآن کریم میں اس مشن کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ تمام ادیان پر اس کو غالب کردے۔ چاہے مشرکین اسے کتنا ہی ناپسند کریں، (الصّف 9:61)

چنانچہ آپ کی جدوجہد کے مختلف مراحل کے بعد آخر کار سورہ توبہ میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ عرب کے لوگوں کو ایمان لانا ہوگا ورنہ ان کو قتل کر دیا جائے گا۔ پچھلے کفار طوفان، آندھی، زلزلے وغیرہ سے ہلاک کیے گئے اور اس دفعہ عذاب کا فیصلہ اہل ایمان کی تلواروں سے کیا گیا۔ تاہم لوگ ایمان لے آئے اور کسی کے قتل کی نوبت نہیں آئی۔

تاہم یہ بات واضح رہے کہ اس بات کا کوئی تعلق عام لوگوں کے ساتھ نہیں۔ عام لوگوں کو دنیا میں مکمل اختیار ہوتا ہے۔ ان کا فیصلہ موت کے بعد ہوتا ہے۔ جبکہ رسولوں کی امت کا فیصلہ اسی دنیا میں کیا جاتا ہے۔ ان کو اختیار اس وقت تک ہوتا ہے جب تک رسول دعوت کے مرحلے میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد اللہ کا فیصلہ آجاتا ہے۔ پھر نہ ماننے کی سزا میں ان کو قتل کر کے جہنم رسید کر دیا جاتا ہے۔

قرآن مجید اس معاملے میں آخری درجے میں واضح ہے کہ عرب کی سرزمین میں جو ہوا وہ خاص اللہ کا فیصلہ اوراس کا خصوصی حکم تھا۔ ہم نے جو آیت اوپر نقل کی ہے اسے دوبارہ پڑھ لیجیے۔ یہ صراحت کے ساتھ ایک پیش گوئی اور اللہ کے فیصلے کا اعلان ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک فعل اور اس

کے فیصلے کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے کسی دینی مطالبے یا عام مسلمانوں کے کرنے کے کام کے طور پر پیش نہیں کر رہے۔ اس سے کسی طور کوئی فرد نہ عام دینی ضابطہ نکال سکتا ہے نہ اپنے لیے کسی قسم کی دینی جدوجہد کا ماخذ قرار دے سکتا ہے۔ نہ اس کی بنیاد پر آج کسی غیر مسلم کو قتل کیا جا سکتا ہے کہ وہ چونکہ ایمان نہیں لایا اس لیے اسے قتل کر دیا جائے گا نہ کسی غیر مسلم ملک پر حملہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ چار مہینے آزادی کے مزے لے لیں اور اس کے بعد ان پر حملہ کر کے ان کو مغلوب کر دیا جائے گا۔ اللہ کا یہ قانون پیغمبروں اور ان کی اقوام کے بارے ہی میں خاص ہے۔ عام لوگوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

روم و ایران کے خلاف صحابہ کا جہاد

روم اور ایران کے خلاف صحابہ کرام نے جو جہاد کیا اس کی نوعیت کو درست طور پر نہ سمجھنے کی بنا پر بعض غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں۔ ہمارے نزدیک اس جہاد کو اگر قرآن مجید اور تاریخ کی مکمل روشنی میں دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کا ظہور تھا جو اس نے سورہ نور میں صحابہ کرام کے ساتھ کیا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے عملِ صالح کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک میں خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان لوگوں کو خلیفہ بنایا جو ان سے پہلے گزرے اور ان کے اس دین کو متمکن کرے گا جس کو ان کے لیے پسندیدہ ٹھہرایا اور ان کی اس خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو درحقیقت وہی لوگ نافرمان ہیں۔ (نور 24 :55)

یہی وہ بات ہے جس کی طرف سورہ آل عمران 3 :27-26 میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ

تعالیٰ اب دنیا کا اقتدار اپنے اِن وفادار بندوں کو دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ تاہم عالم اسباب میں ایسا ہونا بہت مشکل تھا کیونکہ اس وقت دنیا میں دو عظیم ترین سپر پاورز موجود تھیں۔ کم و بیش پوری مہذب دنیا یا اس کا اکثر حصہ ان کے زیر تسلط تھا۔ ان کے وسائل لامحدود تھے اور طاقت بے انتہا۔ مگر اللہ کی حکمت کے تحت یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے مرحلہ دعوت میں ان دونوں میں زبردست جنگ شروع ہوگئی۔ پہلے ایرانی حکمرانی خسرو پرویز نے رومی سلطنت پر حملہ کردیا۔ ایرانیوں نے رومیوں کو بدترین شکستیں دیں اوران کی قوت کو بڑی حد تک ختم کر دیا۔ مگر عین اسی وقت یہ معجزہ ہوا کہ رومیوں کے تن مردہ میں جان پڑی اور ہرقل کی قیادت میں انھوں نے چند برسوں میں ایرانیوں کو پے در پے شکستیں دے کر اپنے سارے علاقے واپس لے لیے۔

قرآن کریم کی سورہ روم میں اسی واقعے کا بطور ایک پیش گوئی ذکر ہے۔ یہ پیش گوئی مکہ میں کی گئی اور عین جس وقت مسلمانوں کو کفار کے خلاف بدر میں فتح ملی رومی بھی ایرانیوں پر غالب آ گئے۔ بالآخر ان میں صلح ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ تھی دونوں لڑتے لڑتے تنگ آ گئے تھے اور باہمی جنگوں کی بنا پر روم و ایران دونوں کی فوجی قوت بری طرح کمزور ہو چکی تھی۔

دوسری طرف کفار سے کئی جنگوں کے بعد عرب میں بھی صلح حدیبیہ ہوگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کا پیغام چونکہ تمام دنیا کے لیے تھا اس لیے صلح حدیبیہ کے بعد آپ نے عرب کے اردگرد موجود ریاستوں کے حکمرانوں کو اسلام کی دعوت کے خطوط لکھے۔ ساتھ میں کسری ایران خسرو پرویز اور قیصر روم ہرقل کو بھی خط بھیجے گئے۔ مگر ایرانی سلطنت کے حکمران کسریٰ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ مبارک کو چاک کر کے یمن میں موجود اپنے گورنر کو آپ کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ جبکہ رومی حکومت کے گورنر شرجیل نے آپ کے سفیر کو قتل کر دیا۔ یہ گویا دونوں سپر پاورز کی طرف سے اعلان جنگ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سپر پاور کی یہ

نفسیات ہوتی ہے کہ وہ اپنے اردگرد کسی طاقت ور ریاست کو برداشت نہیں کرسکتیں۔ اور اسے شکست دینے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔ تاہم جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ایران و روم کی باہمی جنگوں کی بنا پر ان کی فوجی قوت ماضی کے مقابلے میں بہت کمزور ہوچکی تھی۔

مسلمان مورخ عام طور پر اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ تاہم درحقیقت خلافت راشدہ میں اگر ایرانی سلطنت کے پرخچے اڑ گئے اور رومی سلطنت کے دست و بازو کاٹ دیے گئے تو یہ دراصل اللہ کی خصوصی اسکیم کی بنا پر ہوا جس میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ سے قبل ہی ان کی قوت بڑی حد تک ختم کی جاچکی تھی۔ اور گویا کہ یہ طے کردیا گیا تھا کہ اب ان کے علاقے مسلمانوں کو انعام میں دے دیے جائیں گے۔

بہرحال روم و ایران نے جب مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کیا تو اس کے جواب میں مسلمانوں نے بھی جنگی اقدامات کیے۔ اس کی وجہ بالکل واضح تھی کہ سفیروں کو قتل کرنے والوں سے اگر شام کے محاذ پر جنگ نہیں کی گئی تو پھر وہ مدینہ پر حملہ کردیں گے۔ چنانچہ پہلے جنگ موتہ ہوئی پھر جنگ تبوک۔ جنگ تبوک کے موقع پر قرآن کریم کا جو حصہ نازل ہوا اور جواب سورہ توبہ کا حصہ ہے اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ واضح طور پر یہ چاہتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کی پوری قوت اب اسی خارجی محاذ پر صرف ہونی چاہیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی اسی منشا کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حین حیات ہی میں آپ نے ایک تیسرا لشکر بھی محاذ جنگ کی طرف روانگی کے لیے تیار کرلیا تھا۔ تاہم آپ کے انتقال کی بنا پر یہ لشکر سیدنا ابوبکر کے عہد میں روانہ ہوا۔

روم کے محاذ پر فوری کاروائی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ شام جو رومی سلطنت کا صوبہ تھا مدینہ سے بہت قریب تھا۔ چنانچہ اس خطرے کا فوری سدباب کرنا بہت ضروری تھا۔ جبکہ ایرانی سلطنت کا صوبہ عراق مسلمانوں کے مرکز یعنی مدینہ سے کافی دور تھا۔ تاہم ایرانیوں کا خطرہ بھی اتنا ہی شدید

تھا۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ایرانی بادشاہ خسرو پرویز نے اپنے تکبر کی بنا پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ گرفتار کرنے کا گستاخانہ اعلان کیا تھا۔اس اعلان کا صاف مطلب یہ تھا کہ جلد یا بدیر انھوں نے مسلمانوں پر حملہ کرنا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خسرو پرویز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے عین مطابق مارا گیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یمن جو ایرانی سلطنت کے ماتحت تھا، اس کا گورنر باذان آپ کی پیش گوئی کی سچائی سے متاثر ہو کر ایمان لے آیا اور پھر پورا یمن مسلمان ہو گیا۔ یوں ایرانی سلطنت کے ہاتھ سے ایک انتہائی زرخیز صوبہ نکل گیا۔ یہ یقینی امر تھا کہ ایرانی اسے واپس لینے کے لیے جنگ کریں گے۔

تاہم خسرو پرویز کی موت کے بعد ایرانی سلطنت پے در پے اندرونی خلفشار میں گھر گئی۔ یہ ایک دفعہ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی مدد تھی کہ وہ ایرانیوں کے حملے سے قبل ہی ان تمام بغاوتوں سے نمٹ لیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے فوراً بعد رونما ہوئیں۔ ان میں فتنہ ارتداد، جھوٹے نبیوں کا اٹھنا اور منکرین زکوٰۃ سب کی بغاوتیں شامل تھیں۔ چنانچہ سیدنا ابوبکر کی قیادت میں مسلمانوں نے جلد ہی ان تمام فتنوں کا سر کچل دیا۔مگر سیدنا ابوبکر کی دور رس نگاہیں یہ دیکھ چکی تھیں کہ جنگ عربوں کی خصلت میں شامل ہے۔ عام عرب کسان نہیں تھے بلکہ ان کا پیشہ ہی جنگی کاروائی کر کے لوٹ مار کرنا تھا۔عرب میں کوئی فوج نہ تھی۔عرب کا ہر آدمی سپاہی تھا۔

سیدنا ابوبکر نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ان کی جنگی صلاحیت کو کسی درست سمت میں نہیں موڑا گیا تو اس کا رخ دوبارہ مدینے کی طرف ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اہم ترین فوجی کمانڈروں حضرت خالد بن ولید، مثنٰی بن حارثہ شیبانی اور قعقاع بن عمرو وغیرہ کو عراق پر حملے کا حکم دے دیا۔ یہی وہ پس منظر تھا جس میں مسلمان بیک وقت دنیا کی دو سپر پاورز سے ٹکرا گئے اور ہزاروں میل

پر پھیلے شام و عراق کے محاذ پر بیک وقت جنگ شروع کردی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عرب مسلمان جذبہ جہاد سے سرشار تھے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ عرب زبردست جنگجو تھے۔ وہ تاریخ میں پہلی دفعہ ایک باقاعدہ ریاست کی شکل میں منظّم تھے۔ عرب کے بہترین جرنل ان کے سپہ سالار تھے۔ پھر عرب جنگوں میں بہت ہلکے ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ وہ وسیع میدانوں کو زیر رفتار گھوڑوں اور ناقابل عبور صحراؤں کو اونٹوں کی مدد سے باآسانی عبور کر لیتے تھے۔ اس صلاحیت کی بنا پر ان کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ سیکڑوں میل پر پھیلے شام و عراق کے محاذ پر بیک وقت آسانی سے جنگ کر سکتے تھے اور کم تعداد کے باوجود دوسرے محاذوں سے فوری مدد حاصل کر سکتے تھے۔ ان کے مقابلے میں جو دو سلطنتیں تھیں وہ گرچہ تعداد اور وسائل میں ابھی بھی زیادہ تھیں، مگر وہ جنگیں لڑ لڑ کر نڈھال ہو چکی تھیں۔ ان کے ہتھیار بہت بھاری تھے۔ بھاری بھر کم خود اور زرہ بکتر وغیرہ عام حالات میں سپاہی کا دفاع کرتے ہیں، مگر اس کے حملہ کرنے اور نقل و حرکت کی صلاحیت کو بہت کم کر دیتے ہیں۔ اور اگر سامنا عرب جیسے بہترین تلوار باز، تیر انداز اور نیزہ بازوں سے ہو تو پھر یہ دفاعی لباس اپنی اہمیت کھو دیتا تھا کیونکہ جنگ و جدال میں انتہائی مہارت رکھنے والے عربوں کے تیر، تلوار اور نیزے معمولی کھلی جگہ کو بھی نشانہ بنا کر مقابل کو زخمی یا ہلاک کر دیتے تھے۔

یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے وعدے کے ظہور کے لیے وہ سارے اسباب تھے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت سے صحابہ کرام کے لیے اکٹھے کر دیے تھے۔ چنانچہ جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر انسانی تاریخ کا ایک معجزہ رونما ہوا۔ چند برسوں میں ایرانی سلطنت مکمل طور پر ختم ہوگئی اور رومی سلطنت کو اپنے اہم ترین ایشیائی اور افریقی مقبوضات سے نکلنا پڑا اور یہاں مسلمانوں کا اقتدار قائم ہوگیا۔ مسلمانوں نے ان تمام جنگوں میں اعلیٰ ترین کردار کا مظاہرہ کیا۔ وہ مجاہد بھی تھے

اور عابد وزاہد بھی۔ وہ فاتحین بھی تھے اور دین کے داعی بھی۔ چنانچہ ہر جگہ انھوں نے دین کی دعوت دی اور ان کے کردار اور دعوت کی بنا پر ان تمام علاقوں کے لوگ مسلمان ہو گئے۔

تاریخ صاف بتاتی ہے کہ مسلمانوں کا مقصد ہر جگہ جنگ چھیڑنا نہیں تھا بلکہ اُس دور کی سپر پاورز کی جارحیت کو ختم کرنا تھا۔ رومیوں نے جب حضرت عمر کے دور میں دوستانہ مراسم قائم کرنا چاہے تو مسلمانوں نے ان سے مزید جنگ نہ کی اور رومی سلطنت مزید کئی صدیوں تک قائم رہی۔ البتہ ایرانی آخری دم تک لڑ رہے اور جواب میں مسلمانوں کو بھی جنگ کرنا پڑی اور آخر کار ایرانی سلطنت کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ اس کے برعکس حبشہ کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں کی گئی۔ کیونکہ ان کے مسلمانوں کے خلاف کوئی عزائم نہ تھے بلکہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ یوں حبشہ آج تک ایک مسیحی اکثریت کا ملک ہے۔

یہی وہ تاریخی پس منظر ہے جس کی بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ روم و ایران کے خلاف صحابہ کرام کی فتوحات دراصل اُس وعدہ الٰہی کا ظہور تھا جو سورہ نور میں صحابہ کرام سے کیا گیا تھا۔ اس میں جو کردار صحابہ کرام سے مطلوب تھا وہ بلاشبہ انھوں نے پوری طرح ادا کیا لیکن اس کے پیچھے اصل عامل اللہ تعالیٰ کی عنایت تھی جس کی وجہ سے یہ معجزہ رونما ہوا۔ اس میں مسلمانوں کے لیے آج کوئی رہنمائی ہے تو یہ نہیں کہ وہ ایمان و اخلاق میں اپنی پستی اور ہر طرح کی مادی کمزوری کے باوجود پوری دنیا سے جنگ چھیڑ دیں۔ وہ یہ کریں گے تو بری طرح پٹیں گے۔ اصل سبق یہ ہے کہ مسلمان اپنے اندر ایمان و اخلاق کی شمع روشن کریں۔ اس کے بعد اللہ نے چاہا تو ان کے لیے بھی نصرت الٰہی کا ظہور ہو گا۔ وہ بھی وقت کی سپر پاور کا مقام پالیں گے۔ آج اگر کرنے کا کام ہے تو یہی ہے اور مسلمانوں کو کچھ بتانے کا کام ہے تو یہی ہے۔

پروین سلطانہ حنا

غزل

میں تو چل پڑی تیری راہ میں
تیری جستجو تیری چاہ میں

مرے چار سو تو ہے جلوہ گر
کبھی مہر میں، کبھی ماہ میں

مری آرزو ہے تیری طلب
مجھے رکھ لے اپنی نگاہ میں

تجھے دیکھا، دل سے یقیں کیا
میں ہوں چشمِ دید گواہ میں

تجھے یاد رکھا ہے ہر گھڑی
کبھی آہ میں، کبھی واہ میں

تو نے مجھ پہ اپنا کرم کیا
تیری آ گئی ہوں پناہ میں

تیری رحمتوں نے بچا لیا
کبھی دل لگا نہ گناہ میں

ہے یہی تڑپ مجھے بخش دے
میری سسکیوں، میری آہ میں

کبھی کر سکی نہ بغاوتیں
سو یہ عمر گذری نباہ میں

تیرا عکس رنگِ حِنا میں ہے
کبھی سجدہ ریزِ گیاہ میں

ابو یحییٰ کی نئی تصنیف

”حدیثِ دل“

زندگی اور شخصیت کی تعمیر کے لیے رہنما تحریریں

جو دل سے لکھی گئیں اور دل والوں کے لیے لکھی گئیں

نظر ثانی اور خصوصی اضافوں کے ساتھ ابو یحییٰ کی کتاب

”تیسری روشنی“

شائع ہو گئی ہے

- ☆ ابو یحییٰ کی داستان حیات ۔ تلاش حق کی سچی کہانی
- ☆ نفرت اور تعصب کے اندھیروں کے خلاف روشنی کا جہاد
- ☆ جب زندگی شروع ہوگی کے حوالے سے اٹھائے گئے اہم سوالات کا جواب
- ☆ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے والے رویوں کا تفصیلی بیان
- ☆ امت مسلمہ کے اتحاد کا جذبہ رکھنے والوں کے لیے ایک رہنما تصنیف
- ☆ ابو یحییٰ کی ایک اور منفرد تصنیف

(مزید معلومات کے لیے رابطہ: 0332-3051201)

قیامت کو جھٹلانے والے کا کردار

''تم نے دیکھا اس کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟

وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔

پس تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔

جو ریا کاری کرتے ہیں۔

ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں۔''

(الماعون 107)

سزا و جزا کا انکار (تم نے دیکھا اس کو جو آخرت کی سزا و جزا کو جھٹلاتا ہے؟)

وضاحت: کفار مکہ نے آخرت کی سزا و جزا کا انکار کر دیا تھا۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اول تو یہ سزا جزا بعید از عقل چیز ہے۔ بالفرض یہ سزا جزا برپا بھی ہوئی تو انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اللہ نے دنیا میں جو نعمتیں انہیں دی ہیں، وہی آخرت میں بھی دیں گے۔ ان کے بت ان کی سفارش کر کے انہیں اللہ کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ بدقسمتی سے ہر دور کے بدکردار لوگ ایسی ہی تاویلوں سے خود کو آخرت کی سزا جزا سے بری الذمہ سمجھتے ہیں۔ مگر زیادہ وقت نہ گزرے گا کہ ان کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ جبکہ دوسری طرف اہل ایمان ہمیشہ دنیا کی زندگی پر آخرت کو ترجیح دیتے ہیں اور سچی خدا پرستانہ زندگی گزارتے ہیں۔

حدیث: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص دنیا کو اپنا محبوب بنائے گا وہ اپنی آخرت کا ضرور نقصان کرے گا، اور جو کوئی آخرت کو محبوب بنائے گا، وہ اپنی دنیا کا ضرور نقصان کرے گا، پس فنا ہو جانے والی دنیا کے مقابلے میں باقی رہنے والی آخرت اختیار کرو۔ (مسند احمد)